اس شمارے میں

حرفِ اوّل

''روشن خیالی'' اور اسلام	ڈاکٹر اسرار احمد	2

مطالعۂ قرآن حکیم

تعارفِ قرآن (۴)	ڈاکٹر اسرار احمد	3

فہم القرآن

ترجمہ قرآن مجید، مع صرفی ونحوی تشریح	لطف الرحمٰن خان	17

نباتات قرآن

زنجبیل	سید قاسم محمود	31

حکمت نبویؐ

نیکی پھیلانا اور بدی مٹانا	پروفیسر محمد یونس جنجوعہ	35

حکمت اقبال

نصیحت (علامہ اقبال کی ایک نظم)	سید قاسم محمود	38
علامہ اقبال کا پیغام	پروفیسر یوسف سلیم چشتی	41

افکار و آراء

اموالِ حرام کا مصرف	ڈاکٹر یوسف القرضاوی	49

خطوط و نکات

نامے چند (شائع شدہ مضامین کے بارے میں چند خطوط)		55

بحث و نظر

شوال کے چھ روزے	رحمت اللہ بٹر	62

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرہ: ۲۶۹)

دار المطالعہ قرآن اکیڈمی
نمبر 14-4-05
۳۶ کے ماڈل ٹاؤن لاہور

ماہنامہ حکمت قرآن لاہور

بیادگار: ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم
مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد
مدیر منتظم: حافظ عاکف سعید
نائب مدیر: حافظ خالد محمود خضر
ادارہ تحریر:
حافظ عاطف وحید
پروفیسر حافظ نذیر احمد ہاشمی۔ پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

جلد ۲۴ ربیع الاوّل ۱۴۲۶ھ۔ اپریل ۲۰۰۵ء شمارہ ۴

یکے از مطبوعات
مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
۳۶۔ کے۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاہور ۱۴۔ فون: ۵۸۶۹۵۰۱
ویب سائٹ: www.tanzeem.org
سالانہ زرتعاون: 100 روپے' فی شمارہ: 10 روپے
ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ: 700 روپے امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ: 900 روپے

حرفِ اوّل

بسم اللہ الرحمن الرحیم

''روشن خیالی'' اور اسلام

یہود جو سودی نظام اور سیکولرازم کے ذریعے پوری دنیا کے انسانوں کو اپنے شکنجے میں جکڑ چکے ہیں' اب یو این او کے سوشل انجینئرنگ پروگرام کے ذریعے عالم اسلام میں شرم وحیا اور خاندانی نظام کی بچی کھچی اقدار کو ختم کرنے کے درپے ہیں' تاکہ مسلمان بھی یورپی اقوام کی طرح حیوان بن کر پوری طرح ان کے غلام بن جائیں۔ نوآبادیاتی نظام سے آزادی حاصل کرنے کے بعد بھی عالم اسلام کے اکثر و بیشتر حکمران ذہنی طور پر اُنہی کی غلامی اختیار کیے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کے عزائم کی تکمیل میں یہ حکمران ان کے مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ تاہم زیادہ افسوس ناک امر یہ ہے کہ صدر مشرف ان سب حکمرانوں سے بڑھ کر یہود کے اس ایجنڈے کی تکمیل کے لیے کوشاں ہیں۔ چنانچہ صدر مشرف اور ان کے ہمنوا روشن خیالی کے نام پر مذہب بیزاری اور بے حیائی کو فروغ دے رہے ہیں۔ حتیٰ کہ پاکستان میں قانون ساز اداروں اور بعض شعبوں میں جس طرح خواتین کو ۳۳ فیصد نمائندگی دی گئی ہے اس کی مثال امریکہ و یورپ اور دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت بھارت میں بھی نہیں ملتی۔ گویا صدر مشرف شاہ سے بڑھ کر شاہ کی وفاداری نبھاتے ہوئے روشن خیالی میں یہود و ہنود سے بھی آگے نکل جانا چاہتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ نائن الیون کے بعد صدر مشرف نے جو یوٹرن لیا تھا وہ کسی طرح بھی ملک و قوم کے مفاد میں نہ تھا۔ اسی غلط فیصلے کا نتیجہ ہے کہ آج ہم کشمیر جیسے حساس مسئلے کو پس پشت ڈال کر بھارت کے آگے بچھے جا رہے ہیں۔ پاکستان کو اپنے اس موقف پر ڈٹے رہنا چاہیے کہ تمام معاملات سے پہلے کشمیر کے مسئلے کو حل کیا جائے' کیونکہ اس کے بغیر بھارت سے دوستی کی پینگیں بڑھانا کشمیری عوام کی قربانیوں کو ضائع

(باقی صفحہ 16 پر)

تعارفِ قرآن (۴)

از: ڈاکٹر اسرار احمد

قرآن مجید کا موضوع

اب ہم اگلی بحث پر آتے ہیں کہ قرآن کا موضوع کیا ہے۔ کیا قرآن فلسفہ کی کتاب ہے؟ کیا یہ سائنس کی کتاب ہے؟ کیا یہ جیالوجی یا فزکس کی کتاب ہے؟ کس قسم کی کتاب ہے؟ تو پہلی بات یہ سمجھئے کہ قرآن کا موضوع ہے انسان — لیکن انسان کی اناٹومی' اس کی فزیالوجی یا anthropology نہیں' بلکہ انسان کی ہدایت۔ یہ ہدایت کا لفظ قرآن مجید کے لئے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ دیکھئے سورۃ البقرۃ کے شروع ہی میں فرمایا: ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ پھر اس کے وسط میں ارشاد ہوا: ﴿هُدًى لِّلنَّاسِ﴾ یعنی پوری نوعِ انسانی کے لئے ہدایت۔ سورۂ یونس میں فرمایا: ﴿هُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ﴾۔ سورۂ لقمان میں فرمایا: ﴿هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ﴾۔ سورۃ البقرۃ اور سورۃ النمل میں ﴿هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ جبکہ سورۂ آل عمران اور سورۃ المائدۃ میں ﴿هُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ کے الفاظ آئے۔ معلوم ہوا کہ ''هُدًى'' کا لفظ قرآن حکیم کے لئے کثرت کے ساتھ آیا ہے۔ پھر یہ صرف نکرہ نہیں' ''ال'' کے ساتھ معرفہ بن کر بھی کئی جگہ آیا ہے۔ تین مرتبہ تو اِس آیت مبارکہ میں آیا جو رسول اللہ ﷺ کے مقصدِ بعثت کو بیان کرتی ہے: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ (التوبۃ: ۳۳' الفتح: ۲۸' الصف: ۹) هُدًى نکرہ تھا' اَلْهُدٰى معرفہ ہو گیا۔ یعنی ہدایتِ کاملہ' ہدایتِ تامہ' ہدایتِ ابدی۔ اسی

طرح سورۃ النجم میں فرمایا: ﴿وَلَقَدْ جَآءَ هُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى﴾۔ سورۃ الجن کا آغاز جنات کی ایک جماعت کے اس قول ﴿اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا﴾ سے ہوتا ہے۔ آگے چل کر الفاظ آتے ہیں: ﴿وَاِنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰٓى اٰمَنَّا بِهٖ﴾ (آیت ۱۳) گویا سورۃ الجن نے معین کیا کہ ''قُرْاٰنًا عَجَبًا'' اور ''اَلْهُدٰى'' مترادف الفاظ ہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل اور سورۃ الکہف میں آیا ہے: ﴿وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى﴾ (بنی اسراءیل: ۹۴، الکہف: ۵۵) ''کیا شے ہے جو لوگوں کو ایمان لانے سے روکتی ہے جبکہ اُن کے پاس الہدیٰ آیا ہے؟'' تو گویا قرآن کا موضوع ہے ہدایت۔

اب یہ بات ذہن میں رکھئے کہ انسان کے علم کے دو گوشے ہیں' علمِ انسانی دو حصوں میں منقسم ہے۔ (مشہور کہاوت ہے: اَلْعِلْمُ عِلْمَانِ : عِلْمُ الْاَبْدَانِ وَعِلْمُ الْاَدْيَانِ) ایک حصہ ہے مادی دنیا (Physical World) کا علم' مادی حقائق کا علم' جو حواس کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے۔ دیکھنا' سننا' سونگھنا' چکھنا' چھونا ہمارے حواسِ خمسہ ہیں۔ یہ تمام صلاحیتیں ہیں جن سے کچھ معلومات حاصل ہوتی ہیں اور عقل کا کمپیوٹر اِن کو پراسیس کرتا ہے' ان سے نتائج نکالتا ہے اور انہیں سٹور کر لیتا ہے۔ پھر حواس کے ذریعہ سے مزید کوئی معلومات حاصل ہوتی ہیں تو اب ان کو بھی وہ پراسیس کر کے اپنے سابقہ ''memory store'' کے ساتھ ہم آہنگ کر کے کوئی اور نتیجہ اخذ کرتا ہے۔ اس طرح رفتہ رفتہ انسان کا یہ علم بڑھتا چلا جا رہا ہے اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ ابھی اور کہاں تک جائے گا۔ آج سے سو سال پہلے بھی انسان تصور نہیں کر سکتا تھا کہ انسانی علم وہاں پہنچ جائے گا جہاں آج پہنچ چکا ہے۔ یہ علم بالحواس والعقل ہے اور اس علم کا وحی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کا تعلق اس علمِ اَسماء سے ہے جو بالکل شروع میں حضرت آدم علیہ السلام میں ودیعت کر دیا گیا تھا اور یہی خلافت کی بنیاد ہے۔

علم انسانی کے دو گوشوں کے ضمن میں سورۃ البقرۃ کا چوتھا رکوع بہت اہم ہے۔ علم الاسماء کا ذکر اس کے شروع میں ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں

زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں تو فرشتوں کی طرف سے یہ بات استفہاماً پیش کی گئی: ﴿اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ﴾ (آیت ۳۰) ''اور کیا آپ اس کو زمین میں خلیفہ بنائیں گے جو اِس میں فساد پھیلائے گا اور خون ریزیاں کرے گا؟'' فرشتوں کا یہ اشکال اس طرح دُور کیا گیا کہ ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ (آیت ۳۱) ''اور اللہ نے آدم کو تمام نام سکھا دیئے''۔ یہ علمِ اسماء جو آدم کو دیا گیا' یہی خلافتِ ارضی کی بنیاد ہے۔ جو قوم اِس علم کے اندر ترقی کرے گی وہی اقتدارِ ارضی کی حق دار ٹھہرے گی۔ البتہ اس رکوع کے آخر میں فرمایا گیا کہ جب حضرت آدم علیہ السلام سے خطا ہوگئی اور شیطان کے اغوا سے متاثر ہو کر اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی ہوگئی تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کرنے کا بایں طور اعلان کر دیا: ﴿فَتَلَقّٰۤی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیْهِ ؕ﴾ (آیت ۳۷) اس کے بعد ذکر ہے کہ جب آدم اور حوا علیہما السلام کو حکم دیا گیا کہ اب زمین میں جا کر رہو اور وہاں کا چارج سنبھالو تو فرمایا: ﴿فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝﴾ ''تو جب بھی میری طرف سے تمہارے پاس کوئی ہدایت آئے تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا''۔ وہ علمِ ہدایت ہے۔

یہ دو چیزیں بالکل علیحدہ علیحدہ ہیں۔ علمِ اَسماء درحقیقت یوں سمجھئے کہ جیسے آم کی گٹھلی میں آم کا پورا درخت ہوتا ہے۔ وہی گٹھلی تو ہے جو آپ زمین میں دباتے ہیں۔ پھر اگر وہاں پانی پڑتا ہے اور زمین میں روئیدگی کی صلاحیت بھی ہے تو وہ گٹھلی پھٹے گی۔ اس میں سے جو دو پتے نکلیں گے وہ پھلیں پھولیں گے' پروان چڑھیں گے تو درخت بنے گا۔ وہ پورا درخت آم کی گٹھلی میں بالقوۃ (potentially) موجود تھا' البتہ اسے بالفعل (actually) پورا درخت بننے میں تین چار سال لگیں گے۔ تو جس طرح پورا درخت آم کی گٹھلی میں بالقوۃ موجود تھا لیکن وہ آم کا درخت کئی سال کے اندر بالفعل وجود میں آیا' بعینہٖ یہ معاملہ کُل مادی حقائق کا ہے کہ اس ضمن میں کُل علم حضرت آدم علیہ السلام

کے وجود میں بالقوۃ (potentially) ودیعت کر دیا گیا! اب اس کی exfoliation ہو رہی ہے' وہ بڑھتا جا رہا ہے' برگ و بار لا رہا ہے۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا' اس علم کا کوئی تعلق آسمانی ہدایت سے نہیں ہے۔ اب یہ خودرَو پودا ہے جو بڑھتا چلا جا رہا ہے' اور معلوم نہیں کہاں تک پہنچے گا۔ علامہ اقبال نے اس کی صحیح تعبیر کی ہے ؎

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے!

علامہ کی زندگی میں تو انسان نے چاند پر قدم نہیں رکھا تھا' لیکن اب انسان چاند پر قدم رکھ کر آ گیا ہے۔ مزید یہ کہ اب تو جینیٹک انجینئرنگ اپنے کمالات دکھا رہی ہے۔ کلوننگ کے طریقے سے حیوانات پیدا کیے جا رہے ہیں۔ اس انسانی علم کے ساتھ اگر علم وحی یعنی علمِ ہدایت نہ ہو تو یہ علم بجائے خیر کے شر کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ چنانچہ آج یہ علم واقعتاً شیطانی قوت بن چکا ہے' ہلاکت کا سامان بن چکا ہے' تباہی کا ذریعہ بن چکا ہے۔

﴿فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ هُدًی﴾ نے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ تک ارتقائی مراحل طے کیے۔ جیسے جیسے نوعِ انسانی شعور کی منزلیں طے کرتی گئی' اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت میں بھی اضافہ ہوتا گیا' تا آنکہ یہ علمِ ہدایت قرآن حکیم میں آ کر ''اَلْهُدٰی'' (Final Guidance) کی صورت میں مکمل ہو گیا۔ اس ہدایت میں جو ارتقاء ہوا ہے اسے بھی آپ سمجھ لیجئے۔ پہلی کتابیں جو نازل ہوئیں ان میں بھی هُدًی تو تھی۔ سورۃ المائدۃ میں ارشاد ہوا: ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِیْهَا هُدًی وَّنُوْرٌ﴾ (آیت ۴۴) ''ہم نے تورات نازل کی تھی' اس میں ہدایت بھی تھی نور بھی تھا''۔ اسی رکوع میں (سورۃ المائدۃ کا ساتواں رکوع) انجیل کے بارے میں فرمایا: ﴿فِیْهِ هُدًی وَّنُوْرٌ﴾ (آیت ۴۶) ''اس میں بھی ہدایت بھی تھی نور بھی تھا''۔ لیکن یہ ہدایت اور نور درجہ بدرجہ ترقی کرتا رہا ہے' یہاں تک کہ قرآن میں آ کر یہ کامل ہوا ہے اور اَلْهُدٰی بن گیا ہے۔ اب یہ هُدًی نہیں اَلْهُدٰی ہے' یعنی ہدایتِ تامہ۔

اس کی وجہ کیا ہے؟ دیکھئے ایک بچے کو اگر آپ تعلیم دینا چاہتے ہیں تو اس کی ذہنی

سطح کو ملحوظ رکھے بغیر نہیں دے سکتے۔ آپ پرائمری میں زیر تعلیم کسی بچے کے لئے چاہے پی ایچ ڈی استاد رکھ دیں' لیکن وہ استاد بچے کی ذہنی استعداد کی مناسبت سے ہی اسے تعلیم دے سکے گا۔ بچہ رفتہ رفتہ آگے بڑھے گا۔ یہاں تک کہ جب وہ اپنی عقل اور شعور کی پوری شدت' قوت اور بلوغت کو پہنچ جائے گا تب اسے آخری علم پڑھایا جائے گا۔ پہلے وہ تاریخ پڑھ رہا تھا' اب فلسفہ تاریخ پڑھے گا۔ اس حوالے سے اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایت تدریج کے ساتھ اتاری ہے۔ تورات میں صرف احکام ہیں' حکمت ہے ہی نہیں' جبکہ انجیل میں حکمت ہے' احکام ہیں ہی نہیں۔ دونوں چیزیں مل کر ایک بات کو مکمل کرتی ہیں۔ تورات میں صرف احکام ہیں۔ جیسے آپ بچے کو بتا دیتے ہیں کہ بھئی کھانے پینے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے' روزے کا مطلب یہ ہے کہ اب دن بھر کھانا پینا کچھ نہیں ہے۔ چاہے بچہ ابھی چھ سات سال کا ہے' وہ یہ بات سمجھ لیتا ہے۔ اس طرح اسے احکام تو دے دیئے جائیں گے کہ یہ کرو' یہ نہ کرو' یہ Do's ہیں' یہ Donts ہیں۔

چنانچہ تورات میں احکامِ عشرہ (The Ten Commandments) دے دیئے گئے' لیکن ابھی ان کی حکمت نہیں بتائی گئی۔ اس لئے کہ ابھی حکمت کا تحمل انسان کے لئے ممکن نہیں تھا۔ ابھی نوعِ انسانی کا عہدِ طفولیت تھا۔ یوں سمجھئے کہ وہ آج سے ساڑھے تین ہزار سال قبل کا انسان تھا۔ تورات چودہ سو قبل مسیح میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دی گئی۔ اس کے چودہ سو سال بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو انجیل دی گئی' جس میں صرف حکمت ہے' احکام ہیں ہی نہیں۔ لیکن آج سے دو ہزار سال پہلے حضرت مسیح علیہ السلام کے یہ الفاظ انجیل میں موجود ہیں (اب بھی موجود ہیں) کہ آپؑ نے اپنے حواریین سے فرمایا تھا: ''مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنی تھیں' مگر ابھی تم ان کا تحمل نہیں کر سکو گے' جب وہ فارقلیطؑ آئے گا تو تمہیں سب کچھ بتائے گا''۔ یہ محمد رسول اللہ ﷺ کی پیشین گوئی تھی۔ حضرت مسیحؑ نے فرمایا کہ ابھی تم تحمل نہیں کر سکتے۔ گویا تمہاری ذہنی بلوغت کے لئے چھ سو برس مزید درکار ہیں۔ چنانچہ الہدیٰ قرآن حکیم میں آ کر مکمل ہوا ہے۔

قرآن مجید جو ہدایت دیتا ہے اس کے بھی دو حصے ہیں۔ ایک فکر و نظر کی ہدایت

ہے' جس کا عنوان ''ایمان'' ہے۔ اس کا موضوع وہی ہے جو فلسفے کا ہے۔ یعنی کائنات کی حقیقت کیا ہے' زندگی کی حقیقت کیا ہے' زندگی کا مآل کیا ہے' اس کا آغاز کیا ہے' انجام کیا ہے' صحیح کیا ہے' غلط کیا ہے' خیر کیا ہے' شر کیا ہے' علم کیا ہے؟ قرآن مجید کا دوسرا موضوع ہدایتِ عملی ہے' انفرادی سطح پر بھی اور اجتماعی سطح پر بھی۔ یہ اوامر و نواہی اور حلال و حرام کے احکام پر مشتمل ہے۔ پھر اس میں معاشی و معاشرتی احکام بھی ہیں۔ یہ ہدایتِ فکر و نظر اور ہدایتِ فعل و عمل (انفرادی و اجتماعی) قرآن حکیم کا موضوع ہے۔

اس ضمن میں یہ بات نوٹ کر لیجئے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی قرآن حکیم کا موضوع نہیں ہے' قرآن مجید کتابِ ہدایت ہے' سائنس کی کتاب نہیں ہے' البتہ اس میں سائنسی علوم کی طرف اشارے موجود ہیں اور ان کے حوالے موجود ہیں۔ قرآن مجید کائناتی حقائق کو آیاتِ الٰہیہ قرار دیتا ہے۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۶۴ ملاحظہ کیجئے' جسے میں آیت الآیات قرار دیتا ہوں:

﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ﴾

''یقیناً آسمانوں اور زمین کی ساخت میں' رات اور دن کے پیہم ایک دوسرے کے بعد آنے میں' اُن کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لئے ہوئے دریاؤں اور سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں' بارش کے اُس پانی میں جسے اللہ اوپر سے برساتا ہے' پھر اس کے ذریعے سے مردہ زمین کو زندگی بخشتا ہے اور (اپنے اسی انتظام کی بدولت) زمین میں ہر قسم کی جاندار مخلوق کو پھیلاتا ہے' ہواؤں کی گردش میں' اور اُن بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابع فرمان بنا کر رکھے گئے ہیں' ان لوگوں کے لئے بے شمار نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں''۔

یہ سب اللہ کی نشانیاں ہیں۔ ان میں اللہ کی قدرت' اللہ کی عظمت' اللہ کا علمِ کامل' اللہ کی

حکمتِ بالغہ سب کچھ شامل ہے۔تو یہ جو مظاہر طبیعی (Physical phenomena) ہیں' قرآن حکیم ان کا جابجا حوالہ دیتا ہے۔بعض کائناتی حقائق وہ ہیں جن کا تعلق فلکیات (astronomy) سے ہے۔فرمایا:﴿وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ﴾ یعنی یہ تمام اجرامِ سماویہ اپنے اپنے مدار میں تیر رہے ہیں۔معلوم ہوا ہر شے حرکت میں ہے۔ انسان پر ایک دَور ایسا گزرا ہے جب وہ یہ سمجھتا تھا کہ زمین ساکن ہے اور سورج اس کے گرد حرکت کر رہا ہے۔پھر ایک دَور آیا جس میں کہا گیا کہ نہیں' سورج ساکن ہے' زمین حرکت کرتی ہے' زمین سورج کے گرد چکر لگاتی ہے' اور آج ہمیں معلوم ہوا کہ ہر شے حرکت میں ہے۔سورج کا بھی اپنا ایک مدار ہے' اس میں وہ اپنے پورے کنبے سمیت حرکت کر رہا ہے۔یہ نظامِ شمسی اس کا کنبہ ہے' اس پورے کنبے کو لے کر وہ بھی ایک مدار میں حرکت کر رہا ہے۔تو معلوم ہوا کہ الفاظِ قرآنی: ﴿كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ﴾ میں ''كُلٌّ'' کا لفظ جس طرح مفخم اور مبرہن ہو کر' جس شان کے ساتھ آج ہویدا ہوا ہے' آج سے پہلے انسان کو معلوم نہیں تھا۔قرآن مجید میں کائناتی مظاہر کے بارے میں جو بات کہی گئی ہے وہ کبھی غلط نہیں ہو سکتی۔یہ وہ حقیقت ہے جو اِس دَور میں آ کر پوری طرح واضح ہوئی ہے۔

ڈاکٹر موریس بوکائی ایک فرانسیسی سرجن تھے۔انہوں نے قرآن اور بائبل دونوں کا تقابلی مطالعہ کیا۔واضح رہے کہ بائبل سے مراد عہد نامہ قدیم (Old Testament) اور عہد نامہ جدید (New Testament) دونوں ہیں۔تقابلی مطالعہ کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ پورے قرآن میں کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے جسے ہمارے سائنسی انکشافات میں سے کسی نے غلط ثابت کیا ہو' جب کہ تورات میں بے شمار چیزیں ایسی ہیں کہ سائنس انہیں غلط ثابت کر چکی ہے۔اس پر انہوں نے ۲۵۰ صفحات کی کتاب تحریر کی: '' The Bible, The Quran and Science''۔سوال پیدا ہوتا ہے کہ تورات بھی تو اللہ کی کتاب ہے' پھر اس میں ایسی چیزیں کیوں آ گئیں جو سائنسی حقائق کے خلاف ہیں۔اس کا جواب یہ ہے کہ اصل

تورات تو چھٹی صدی قبل مسیح ہی میں گم ہوگئی تھی جب بخت نصر کے ہاتھوں یروشلم کی تباہی ہوئی تھی۔ اس کے ڈیڑھ سو برس بعد کچھ لوگوں نے تورات کو یادداشتوں سے مرتب کیا۔ لہٰذا اُس وقت انسانی علم کی جو سطح تھی اس کے اعتبارات سے تاویلات تورات میں شامل ہوگئیں' کیونکہ انسان تو اپنی ذہنی سطح کے مطابق ہی سوچ سکتا ہے۔ تورات میں تحریف ہونے کی وجہ سے اِس میں ایسی چیزیں در آئیں جو سائنس کی رو سے غلط ثابت ہوئیں۔ البتہ قرآن میں ایسی کوئی تاویل نہیں ہوئی اور اس کی حفاظت کا اللہ تعالیٰ نے خود ذمہ لیا ہے۔ یہ بات بڑی اہم ہے۔ اس کو بڑے خوبصورت انداز میں ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم نے کہا ہے کہ یہ کائنات اللہ کا فعل ہے' اس کی تخلیق اور اس کی تدبیر ہے' جبکہ قرآن اللہ کا قول ہے' اور اللہ تعالیٰ کے قول و عمل میں تضاد ممکن نہیں ہے۔ کسی انسان کے قول و عمل میں بھی اگر کوئی تضاد ہو تو وہ انسانیت کی سطح سے نیچے اتر جاتا ہے' اللہ تعالیٰ کے قول اور عمل میں تضاد کیسے ہوسکتا ہے؟ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ ایک دَور میں انسانوں نے بات سمجھی نہ ہو' اُن کا ذہن وہاں تک پہنچا نہ ہو' ان کی معلومات کا دائرہ ابھی اس حد تک ہو کہ ان حقائق تک نہ پہنچا جا سکے۔ لیکن جیسے جیسے وقت آئے گا مزید حقائق منکشف ہوں گے اور یہ بات زیادہ سے زیادہ واضح سے واضح تر ہوتی چلی جائے گی کہ جو کچھ قرآن نے فرمایا ہے وہی برحق ہے۔ ہاں آج سے پہلے انسانی ذہن اِس حد تک رسائی حاصل کرنے کا اہل نہیں تھا۔ سورۃ حٰمٓ السجدۃ کی آخری سے پہلی آیت ذہن میں رکھیے:

﴿سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۭ﴾

''ہم انہیں دکھاتے چلے جائیں گے اپنی نشانیاں آفاق میں بھی اور خود اُن کی جانوں میں بھی' یہاں تک کہ یہ بات پوری طرح نکھر کر اُن کے سامنے واضح ہو جائے گی کہ یہ قرآن ہی حق ہے''۔

ڈاکٹر کیتھ این مُور کینیڈا کے بہت بڑے ایمبریالوجسٹ ہیں۔ ان کی کتاب علمِ جنین (Embriology) میں سند مانی جاتی ہے اور یونیورسٹی کی سطح پر بطور ٹیکسٹ بک

پڑھائی جاتی ہے۔ انہوں نے قرآن حکیم کا مطالعہ کرنے کے بعد انتہائی حیرت کا اظہار کیا ہے کہ آج سے چودہ سو برس قبل جبکہ نہ مائیکروسکوپ موجود تھی اور نہ ہی dissection ہوتا تھا' قرآن نے علمِ جنین کے متعلق جو معلومات دی ہیں وہ صحیح ترین حقائق پر مشتمل ہیں۔ ڈاکٹر موصوف سورۃ المؤمنون کی آیات ۱۲ تا ۱۴ کا مطالعہ کرتے ہوئے انگشت بدنداں ہیں:

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۤ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ۭ﴾

''ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا' پھر اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا' پھر اُس بوند کو لوتھڑے کی شکل دی' پھر لوتھڑے کو بوٹی بنا دیا' پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں' پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا' پھر اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا کر کھڑا کیا''۔

ان کا کہنا ہے کہ واقعہ یہ ہے کہ انسانی تخلیق کے مراحل کی اس سے زیادہ صحیح تعبیر ممکن نہیں ہے۔ تو یہ حقیقت ذہن میں رکھئے کہ اگرچہ قرآن مجید سائنس کی کتاب نہیں ہے' لیکن جن سائنسی حقائق یا سائنسی مظاہر (phenomena) کا قرآن نے حوالہ دیا ہے وہ یقیناً حق ہیں' چاہے تا حال ہم ان کی حقانیت کو نہ سمجھ پائے ہوں۔ مثلاً آج بھی مجھے نہیں معلوم کہ قرآن جو ''سات آسمان'' کہتا ہے تو اِن سے کیا مراد ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ایک وقت آئے گا جب انسان سمجھے گا کہ ''سات آسمان'' کے یہ الفاظ ٹھیک ٹھیک اس حقیقت پر منطبق ہوتے ہیں جو آج ہمارے علم میں آئی ہے' پہلے نہیں آئی تھی۔ البتہ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں' عملی اعتبار سے یہ نکتہ بہت اہم ہے کہ قرآن سائنس یا ٹیکنالوجی کی کتاب نہیں ہے اور اس حوالے سے ایک بڑا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر ہمارے اسلاف نے اپنے دَور کی معلومات کی سطح پر قرآن کی ان آیات کا کوئی خاص مفہوم معین کیا تو ہمارے لئے لازم نہیں ہے کہ ہم اس کی پیروی کریں۔ ہم قرآن میں بیان کردہ سائنسی مظاہر کو اس سائنسی ترقی کے حوالے سے سمجھیں گے جو روز بروز ہو

رہی ہے۔ یہاں تک کہ آخری بات عرض کر رہا ہوں کہ اس معاملے میں خود محمد رسول اللہ ﷺ سے بھی اگر کوئی بات منقول ہو تو وہ بھی قطعی نہیں سمجھی جائے گی' کیونکہ حضور ﷺ یہ چیزیں سکھانے کے لئے نہیں آئے تھے۔ یہ بات اگرچہ بہت سے لوگوں پر ثقیل اور گراں گزرے گی لیکن صحیح طرز عمل یہی ہوگا کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے ضمن میں اگر حضور ﷺ کی کوئی حدیث بھی سامنے آجائے تو اس کو بھی ہم دلیلِ قطعی نہیں سمجھیں گے۔

اس سلسلے میں تأبیر نخل کا واقعہ بہت اہم ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ حضور ﷺ کی پیدائش مکہ کی ہے' ہجرت تک ساری زندگی آپ نے وہاں گزاری' وہ وادیٔ غیر ذی زرع ہے' جہاں کوئی پیداوار' کوئی زراعت' کوئی کاشت ہوتی ہی نہیں تھی' لہٰذا آپؐ کو اس کا کوئی تجربہ سرے سے تھا ہی نہیں۔ ہاں تجارت کا بھرپور تجربہ تھا اور اس کے تمام اَسرار و رموز سے آپؐ واقف تھے۔ آپؐ مدینہ تشریف لائے تو آپؐ نے دیکھا کہ کھجوروں کے سلسلہ میں انصارِ مدینہ ''تأبیر نخل'' کا معاملہ کرتے تھے۔ کھجور ایک ایسا پودا ہے جس کے نر اور مادہ پھول علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں۔ اگر اس کے نر اور مادہ پھولوں کو قریب لے آئیں تو اس کے بارآور ہونے کا امکان زیادہ ہو جاتا ہے۔ اہل مدینہ کو یہ بات تجربے سے معلوم ہوئی تھی اور وہ اس پر عمل پیرا تھے۔ مدینہ تشریف آوری پر رسول اللہ ﷺ نے جب اہل مدینہ کا یہ معمول دیکھا تو اُن سے فرمایا کہ اگر آپ لوگ ایسا نہ کریں تو کیا ہے؟ ایسا نہ کرنا شاید تمہارے حق میں بہتر ہو۔ یہ بات آپ ﷺ نے اپنے اجتہاد اور فہم کے مطابق اس بنیاد پر فرمائی کہ فطرت اپنی دیکھ بھال خود کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فطرت کا نظام انسانوں پر نہیں چھوڑا' بلکہ یہ تو خود کار نظام ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ آپ لوگ اس قدرتی نظام میں دخل نہ دیں تو کیا ہے؟ البتہ آپؐ نے روکا نہیں۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے لئے حضور ﷺ کا اتنا کہنا بھی گویا حکم کے درجہ میں تھا۔ انہوں نے اس سال وہ کام نہیں کیا' لیکن فصل کم ہوگئی۔ اب وہ ڈرتے ڈرتے' جھجکتے جھجکتے حضور ﷺ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ حضور! ہم نے اس مرتبہ تأبیر نخل نہیں کی تو فصل کم ہوئی ہے۔ اس پر

آپ ﷺ نے فرمایا: ((اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاَمْرِ دُنْیَاکُمْ)) اس حدیث کا ایک ایک لفظ یاد کر لیجئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ جو تمہارے اپنے دُنیوی اور مادی معاملات ہیں جن کی بنیاد تجربہ پر ہے' یہ تم مجھ سے بہتر جانتے ہو۔ تم زیادہ تجربہ کار ہو' تم ان حقائق سے زیادہ واقف ہو۔ ایک دوسری روایت میں رسول اللہ ﷺ کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں: ((اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ ' اِذَا اَمَرْتُکُمْ بِشَیْءٍ مِّنْ دِیْنِکُمْ فَخُذُوْا بِہٖ ' وَاِذَا اَمَرْتُکُمْ بِشَیْءٍ مِنْ رَّاْیِیْ فَاِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ)) ''میں تو ایک بشر ہوں۔ جب میں تمہیں تمہارے دین کے بارے میں کوئی حکم دوں تو اس سے سرتابی نہ کرنا' لیکن جب میں تمہیں اپنی رائے سے کوئی حکم دوں تو جان لو کہ میں ایک بشر ہی ہوں''۔ (یہ دونوں حدیثیں صحیح مسلم کی ہیں۔ کتاب الفضائل' باب وجوب امتثال ما قالہ ﷺ شرعاً دون ما ذکرہ من معایش الدنیا علی سبیل الرأی) گویا آپ ﷺ نے واضح فرما دیا کہ میں یہ چیزیں سکھانے نہیں آیا' میں جو کچھ سکھانے آیا ہوں وہ مجھ سے لو!

اس اعتبار سے یہ حدیث بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ ظاہر ہے آپؐ ٹیکنالوجی سکھانے نہیں آئے تھے۔ آپؐ طب و جراحت سکھانے نہیں آئے تھے' آپؐ کوئی اور سائنس پڑھانے نہیں آئے تھے۔ ورنہ تو ہم شکوہ کرتے کہ آپؐ نے ہمیں ایٹم بم بنانا کیوں نہیں سکھا دیا؟ جب رسول اللہ ﷺ نے یہ فرما دیا کہ ((اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاَمْرِ دُنْیَاکُمْ)) تو ہمارے لئے یہ بات آخری درجے میں سند ہے کہ جیسے جیسے سائنسی انکشافات ہو رہے ہیں' جیسے جیسے علم انسانی کی exploration ہو رہی ہے' ویسے ویسے حقائقِ فطرت ہماری نگاہوں کے سامنے منکشف ہو رہے ہیں۔ جیسے آم کی گٹھلی سے آم کا پورا درخت وجود میں آتا ہے ایسے ہی حضرت آدم علیہ السلام کے وجود میں علم بالحواس اور علم بالعقل کا جو mechanism رکھ دیا گیا تھا' یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ علم پھیل رہا ہے۔ اس نے جو بھی چیزیں ہمارے سامنے آئیں ان میں کہیں رکاوٹ نہیں ہے کہ ہم سلف کی بات کو لے کر بیٹھ جائیں کہ سائنس خواہ کچھ بھی کہے ہم تو اسلاف کی بات مانیں گے۔ یہاں پر اس طرزِ عمل کے لئے کوئی دلیل اور بنیاد نہیں۔

قرآن کا اصل موضوع ایمان ہے۔ ماوراء الطبیعیاتی حقائق عالم غیب سے متعلق ہیں' جو ہمارے عالمِ محسوسات سے ماوراء ہیں' جس کی خبریں ہمیں صرف وحی سے مل سکتی ہیں۔ علم حقیقت جسے ہم اجمالی طور پر ایمان کہتے ہیں یہ قرآن کا اصل موضوع ہے' یعنی ہدایتِ فکری و عملی۔ تمدنی میدان میں' معاشی و اقتصادی اور معاشرتی میدان میں یہ کرو اور یہ نہ کرو۔ یہ چیزیں کھانے پینے کی ہیں' یہ چیزیں کھانے پینے کی نہیں ہیں۔ یہ حرام ہیں' یہ نجس ہیں۔ یہ علم حضور ﷺ نے دیا ہے اور قرآن کا موضوع اصل میں یہی ہے۔ البتہ قرآن میں جو سائنسی ریفرنسز آئے ہیں' وہ غلط نہیں ہیں' وہ لازماً درست ہیں۔

انسانی علم کے تین دائرے ہیں۔ ایک علم بالحواس ہے' یہ انسانی علم کا پہلا دائرہ ہے۔ حواس کے ذریعے ہمیں معلومات حاصل ہوتی ہیں' جنہیں آج کل ہم sense data کہتے ہیں۔ آنکھ نے دیکھا' کان نے سنا' ہاتھ نے اس کی پیائش کی۔ اس کے بعد دوسرا دائرہ علم بالعقل ہے۔ عقل sense data کو پراسیس کرتی ہے۔ اس ضمن میں استدلال اور استنباط کے اصول معین کیے گئے ہیں۔ انسان اپنے حواس خمسہ کے ذریعے علم حاصل کرتا ہے' پھر عقل ان معلومات کو process کرتی ہے تو انسان کسی نتیجے پر پہنچتا ہے۔ یوں عقل حواس کی محتاج ہوئی' لیکن عقل و حواس کے ماورا بھی ایک علم ہے جسے شاہ اسماعیل شہیدؒ نے علم بالقلب کا نام دیا ہے۔ آج اسے extra sensory perceptions کہا جا رہا ہے۔ یہ علم کا تیسرا دائرہ ہے۔ اس سے پہلے ادب میں اس کے لئے وجدان (intuition) کا لفظ تھا۔ یہ علم بالقلب درحقیقت وہ خاص انسانی علم ہے جس سے آج کے مادہ پرست واقف نہیں ہیں۔ وحی کا تعلق اسی تیسرے دائرے سے ہے۔ اس لئے کہ وحی کا نزول قلب پر ہوتا ہے۔ از روئے الفاظ قرآنی:

﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۝ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۝﴾ (الشعراء)

عقل اور حواس سے حاصل ہونے والے علوم میں تمام فزیکل سائنسز' میڈیکل سائنسز اور ٹیکنالوجی کے مضامین شامل ہیں۔ انسان نے مختلف چیزوں کے خواص معلوم کئے' کچھ طبعی اور کیمیائی تبدیلیوں کے اصول دریافت کیے۔ پھر ان اصولوں سے جو

معلومات حاصل ہوئیں ان کو استعمال کیا۔ اس سے انسان کی ٹیکنالوجی ترقی کرتی جا رہی ہے اور ابھی نامعلوم کہاں تک پہنچے گی۔ یہ ایک علم ہے جس کا ذکر قرآن حکیم میں ﴿عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّهَا﴾ کے الفاظ میں کر دیا گیا۔ البتہ انسان صرف اس علم پر قانع نہیں رہا' اس لیے کہ اس سے تو صرف جزوی علم حاصل ہوتا ہے' انسان ایک ایک جزو' قدم بقدم سیکھتا ہے۔ انسان کی ایک طلب (urge) ہے کہ وہ ماہیت معلوم کرنا چاہتا ہے کہ کائنات کی حقیقت کیا ہے؟ میری حقیقت کیا ہے؟ علم کی حقیقت' خیر و شر کی حقیقت کیا ہے؟ ظاہر بات ہے کہ آج سے ایک ہزار سال قبل کے انسان کی معلومات (علم بالحواس اور علم بالعقل کے اعتبار سے) بڑی محدود تھیں' لیکن اُس وقت کے انسان کو بھی اس چیز کی ضرورت تھی کہ وہ کوئی رائے قائم کرے کہ یہ کائنات جس کا میں ایک فرد ہوں' اس کی حقیقت کیا ہے' خود میری حقیقت کیا ہے؟ میری زندگی کا آغاز کیا ہے؟ میرا اس کے ساتھ ربط و تعلق کیا ہے؟ اس سفر کی منزل کیا ہے؟ میں اپنی زندگی میں کیا کروں' کیا نہ کروں؟ کیا کرنا صحیح ہے کیا کرنا غلط ہے؟ یہ انسان کی ضرورت ہے۔ لہٰذا اس ضرورت کے تحت جب انسان نے سوچنا شروع کیا تو فلسفہ کا آغاز ہوا جو گتھیوں کو سلجھانا چاہتا ہے۔ ان گتھیوں کو سلجھانے کے لیے پھر انسان نے عقل کے گھوڑے دوڑائے' اپنی منطق کو استعمال کیا۔ فلسفہ' مابعد الطبیعیات' الٰہیات' اخلاقیات اور نفسیات' یہ تمام علوم انسانی علوم میں سے ہیں۔ گویا کہ علم بالحواس اور علم بالعقل کے نتیجے میں یہ دو علم وجود میں آئے۔ ایک فزیکل سائنسز کا علم جس کا تعلق ٹیکنالوجی سے ہے' دوسرا سوشل سائنسز کا علم جس میں فلاسفی' سوشیالوجی' نفسیات' اخلاقیات' اقتصادیات اور سیاسیات وغیرہ شامل ہیں۔

جان لیجئے کہ ھُدًی جس کی تکمیلی شکل "الھُدٰی" قرآن مجید ہے' اس کا موضوع انسانی علم کا دائرۂ اوّل نہیں ہے۔ یہ سائنس کی کتاب نہیں ہے اور نہ ہی سائنس پڑھانے یا ٹیکنالوجی سکھانے آئی ہے۔ انبیاء اس لیے نہیں بھیجے گئے۔ اگرچہ قرآن حکیم میں سائنسی مظاہر کی طرف حوالے موجود ہیں اور وہ لازماً درست ہیں' لیکن وہ قرآن کا

اصل موضوع نہیں ہے۔ جیسے جیسے انسان کے سائنسی علم میں تدریجاً ترقی ہو رہی ہے اسی طرح ان ریفرنسز کو سمجھنا بھی انسان کے لیے ممکن ہو رہا ہے۔ البتہ قرآن کا اصل موضوع مابعد الطبیعیات ہے۔ پھر فکر و عمل دونوں کے لیے راہنمائی درکار ہے' جیسے کہ کسی راستے پر چلنے والے کو ''روڈ سائنز'' کی ضرورت ہوتی ہے کہ اِدھر نہ جانا' اُدھر خطرہ ہے' ہلاکت ہے۔ اسی طرح انسان کو سفرِ حیات میں ان cautions کی ضرورت ہے کہ ادھر خطرہ ہے' یہ تمہارے لیے ممنوع ہے' یہ حرام ہے' یہ نقصان دہ ہے' اس میں ہلاکت ہے' چاہے تمہیں ہلاکت نظر نہیں آ رہی لیکن تم ادھر جاؤ گے تو تمہارے لیے ہلاکت ہے۔ درحقیقت یہ قرآن کا اصل موضوع ہے۔

بقیہ: حرفِ اوّل

کرنے کے مترادف ہے۔ چنانچہ سید علی گیلانی نے بھی کہا ہے کہ پاکستان کی خوش فہمی جلد ہی دور ہو جائے گی۔ دراصل بھارت ہمیں گڑ دے کر مارنے کی پالیسی پر عمل پیرا ہے' چنانچہ بھارت سے کوئی بعید نہیں کہ کشمیر بس سروس کنٹرل لائن کو سرحد بنانے کی سکیم ہی کا حصہ ہو۔

موجودہ حالات میں ہماری مذہبی جماعتوں کا کردار ناقابل فہم ہے۔ دینی جماعتوں کے قائدین کو ملک میں نفاذِ اسلام کے لئے متحد ہو کر تحریک چلانی چاہیے' لیکن متحدہ مجلس عمل مہنگائی اور جمہوریت کے نام پر تحریک چلا رہی ہے۔ ماضی کی تاریخ گواہ ہے کہ ایسی وقتی تحریکوں کا نتیجہ گاؤ رفت خر آمد کے سوا کچھ نہیں نکلا۔ موجودہ اسلام مخالف یلغار کا مقابلہ کرنے کے لیے دینی جماعتوں اور عوام کو اٹھ کھڑا ہونا چاہیے' کیونکہ جب تک ہم اس معرکۂ روح و بدن میں شر کے خلاف خم ٹھونک کر سامنے نہیں آئیں گے ابلیس اور اُس کے ایجنٹ اسی طرح دندناتے رہیں گے۔ oo

(صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن محترم ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ کے مسجد دارالسلام باغ جناح میں ۸/اپریل ۲۰۰۵ء کے خطاب جمعہ کا پریس ریلیز)

ترجمۂ قرآن مجید

مع صرفی و نحوی تشریح

از: لطف الرحمٰن خان
نظر ثانی: حافظ نذیر احمد ہاشمی

سورۃ البقرۃ (مسلسل)

آیت ۱۴۲

﴿سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا ۭ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۭ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝﴾

ترکیب: ''سَيَقُوْلُ'' کا فاعل ''السُّفَهَآءُ'' ہے اور ''مِنَ النَّاسِ'' جار مجرور متعلق محذوف ''كَائِنِيْنَ'' حال ہے ''السُّفَهَآءُ'' کا۔ ''مَا'' استفہامیہ ہے اور مبتدأ ہے جبکہ جملہ فعلیہ ''وَلّٰهُمْ'' اس کی خبر ہے۔ ''عَنْ قِبْلَتِهِمْ'' متعلق خبر ہے اور یہ ''قِبْلَتِهِمْ'' موصوف ہے جبکہ ''الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا'' اس کی صفت ہے۔ ''اَلْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ'' مبتدأ موخر ہیں ان کی خبر محذوف ہے اور ''لِلّٰهِ'' قائم مقام خبر مقدم ہے۔ ''يَهْدِيْ'' کا فاعل اس میں شامل ''هُوَ'' کی ضمیر ہے جو اللہ کے لیے ہے اور ''مَنْ'' اس کا مفعول ہے۔ ''يَشَاءُ'' کا فاعل بھی ''هُوَ'' کی ضمیر ہے جو اللہ کے لیے ہے اور یہ جملہ مقولہ ہے ''قُلْ'' کا۔

ترجمہ

سَيَقُوْلُ: کہیں گے	السُّفَهَآءُ: بیوقوف لوگ
مِنَ النَّاسِ: لوگوں میں سے	مَا: کس چیز نے
وَلّٰهُمْ: پھیرا اُن کو	عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ: ان کے اس قبلے سے

كَانُوْا :وہ لوگ تھے
قُلْ :آپ کہیے
الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ :مشرق اور مغرب
مَنْ يَّشَآءُ :اس کو جس کو وہ چاہتا ہے
عَلَيْهَا :جس پر
لِلّٰهِ :اللہ ہی کے لیے ہے
يَهْدِيْ :وہ ہدایت دیتا ہے
اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ :ایک سیدھے راستے کی طرف

آیت ۱۴۳

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۭ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰي عَقِبَيْهِ ۭ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَي الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ۭ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾

وس ط

وَسَطَ (ض) وَسْطًا :کسی کے درمیان میں بیٹھنا' درمیان میں ہونا۔ ﴿فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا﴾ (العٰدیٰت) ''پھر وہ سب (یعنی گھوڑوں کے رسالے) اس کے درمیان میں بیٹھے (یعنی گھس گئے جم کر)''

وَسُطَ (ک) وَسَاطَةً : شریف ہونا' افضل ہونا۔

اَوْسَطُ (مؤنث وُسْطٰی) : افعل التفضیل ہے۔ زیادہ درمیان یعنی ٹھیک یا بالکل درمیان۔ ﴿فَكَفَّارَتُهٗ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ﴾ (المائدۃ:۸۹) ''تو اُس کا کفارہ ہے کھانا کھلانا دس مسکینوں کو' اُس کے اوسط سے جو تم لوگ کھلاتے ہو اپنے گھر والوں کو۔'' ﴿حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى﴾ (البقرۃ:۲۳۸) ''تم لوگ نگہبان رہو نمازوں پر اور درمیانی نماز پر۔''

وَسَطٌ : معتدل' متوازن' یعنی افراط و تفریط سے پاک (آیت زیر مطالعہ) یہ مذکر' مؤنث' واحد' جمع سب کے لیے آتا ہے۔

ع ق ب

عَقَبَ (ض ن) عَقْبًا : پیر کا پچھلا حصہ یعنی ایڑی مارنا۔ اس بنیادی مفہوم کے ساتھ

متعدد معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے: (۱) پیچھے آنا۔ (۲) جانشین ہونا۔ (۳) ایک چیز جانے کے بعد اُس کا دوسرا رُخ سامنے آنا' جیسے رات کے بعد صبح کا آنا' یعنی نتیجہ ظاہر ہونا' بدلہ سامنے آنا۔

عُقْبٰی: افعل التفضیل کا مؤنث ہے (فُعْلٰی کے وزن پر)۔ زیادہ یا سب سے پیچھے' یعنی آخر میں ظاہر ہونے والا نتیجہ یا بدلہ۔ اس بنیادی مفہوم کے ساتھ زیادہ تر دو معانی میں آتا ہے۔ (۱) آخری۔ (۲) بدلہ۔ ﴿وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ﴾ (الرعد) ''اور وہ لوگ دفع کرتے ہیں بھلائی سے برائی کو' ان لوگوں کے لیے ہے آخری گھر۔'' ﴿تِلْكَ عُقْبَى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا ۡ وَّعُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ﴾ (الرعد) ''یہ بدلہ ہے ان لوگوں کا جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا' اور کافروں کا بدلہ ہے آگ۔''

عَقِبٌ ج اَعْقَابٌ (اسم ذات): کسی چیز کا پچھلا حصہ۔ اس بنیادی مفہوم کے ساتھ متعدد معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے: (۱) ایڑی۔ (۲) بیٹے' پوتے وغیرہ۔ ﴿فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ﴾ (الانفال: ۴۸) ''پھر جب آمنے سامنے ہوئیں دونوں فوجیں تو وہ پسپا ہوا اپنی دونوں ایڑیوں پر۔'' ﴿وَجَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً فِىْ عَقِبِهٖ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ﴾ (الزخرف) ''اور اُس نے بنایا اس کو ایک باقی رہنے والا فرمان اپنی اولاد میں' شاید وہ لوگ رجوع کریں۔'' ﴿يَرُدُّوْكُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ﴾ (آل عمران: ۱۴۹) ''تو وہ پھیر دیں گے تم لوگوں کو تمہاری ایڑیوں پر۔''

عُقْبٌ (اسم ذات): نتیجہ' انجام۔ ﴿هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ عُقْبًا﴾ (الکہف) ''وہ بہتر ہے بطور بدلے کے اور بہتر ہے بطور انجام کے۔''

عَاقِبَةٌ (اسم ذات): بدلہ (خواہ اچھا ہو یا برا) ﴿فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ﴾ (آل عمران) ''پس تم لوگ دیکھو کیسا تھا جھٹلانے والوں کا بدلہ۔'' ﴿اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ﴾ (ھود) ''بیشک بدلہ ہے تقویٰ اختیار کرنے والوں کے لیے۔'' ﴿وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ﴾ (الحج) ''اور اللہ کی ہی ملکیت ہے تمام کاموں کا بدلہ۔''

عَقَبَةٌ: دشوار گزار گھاٹی۔ ﴿فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ﴾ (البلد) ''تو اُس نے عبور نہیں کیا گھاٹی کو۔''

اَعْقَبَ (افعال) اِعْقَابًا: کسی چیز کے بدلے میں کچھ دینا' بدلہ دینا۔ ﴿فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِىْ قُلُوْبِهِمْ﴾ (التوبۃ: ۷۷) ''تو اس نے بدلے میں دیا ان کو ایک نفاق ان کے

دلوں میں۔''

عَقَّبَ (تفعیل) تَعْقِیْبًا: پیچھے ہونا' پیچھے ڈالنا۔ ﴿وَلّٰی مُدْبِرًا وَّلَمْ یُعَقِّبْ ؕ﴾ (النمل:۱۰) ''وہ چل دیا پیٹھ پھیرتے ہوئے اور پیچھے ہوا ہی نہیں (یعنی مڑ کر نہ دیکھا)''

مُعَقِّبٌ (اسم الفاعل): پیچھے ہونے والا' پیچھے ڈالنے والا۔ ﴿وَاللّٰہُ یَحْکُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُکْمِہٖ ؕ﴾ (الرعد:۴۱) ''اور اللہ حکم کرتا ہے' کوئی پیچھے ڈالنے والا نہیں ہے اس کے حکم کو۔'' ﴿لَہٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَیْنِ یَدَیْہِ وَمِنْ خَلْفِہٖ﴾ (الرعد:۱۱) ''اس کے ہیں (یعنی اس کی ملکیت ہیں) پیچھے رہنے والے (یعنی پہرے دار) اس کے (یعنی انسان کے) آگے سے اور اس کے پیچھے سے۔''

عَاقَبَ (مفاعلہ) مُعَاقَبَۃً: ایک دوسرے کے پیچھے پڑنا۔ اس بنیادی مفہوم کے ساتھ متعدد معانی میں آتا ہے۔ جیسے: (۱) کسی کے ساتھ زیادتی کرنا۔ (۲) کسی زیادتی کا بدلہ دینا۔ (۳) کسی زیادتی پر گرفت کرنا' سزا دینا۔ ﴿وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِہٖ ؕ﴾ (النحل:۱۲۶) ''اور اگر تم لوگ بدلہ لو تو بدلہ لو اُس کے جیسا تمہارے ساتھ زیادتی کی گئی تھی۔'' ﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ﴾ (البقرۃ) ''اور تم لوگ جان لو کہ اللہ سزا دینے کا سخت ہے۔''

عَاقِبْ (فعل امر): تُو بدلہ دے' سزا دے۔ دیکھیے سورۃ النحل کی آیت ۱۲۶۔

ض ی ع

ضَاعَ (ض) ضِیَاعًا: کسی چیز کا تلف ہونا' بے کار ہونا۔

اَضَاعَ (افعال) اِضَاعَۃً: کسی چیز کا تلف کرنا' ضائع کرنا۔ ﴿اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْکُمْ﴾ (آل عمران:۱۹۵) ''کہ میں ضائع نہیں کرتا کسی عمل کرنے والے کے عمل کو تم میں سے۔''

ر ء ف

رَءَفَ (ف) رَأْفَۃً: نرم دل ہونا' شفیق ہونا۔

رَءُوْفٌ: فعول کے وزن پر مبالغہ ہے۔ بہت نرمی کرنے والا' بہت شفقت کرنے والا۔ ﴿وَاللّٰہُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ﴾ (البقرۃ) ''اور اللہ بہت نرمی کرنے والا ہے بندوں سے''۔

رَاْفَۃٌ (اسم ذات): نرمی' شفقت۔ ﴿وَجَعَلْنَا فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْہُ رَاْفَۃً وَّرَحْمَۃً ؕ﴾ (الحدید:۲۷) ''اور ہم نے بنائی (یعنی رکھی) ان کے دلوں میں جنہوں نے

پیروی کی ان (علیہ السلام) کی نرمی اور رحمت۔"

ترکیب : "وَكَذٰلِكَ" واو استیناف' کاف حرف جر اسم مجرور' جار مجرور متعلق محذوف کے ساتھ بوضع نصب میں ہے' مصدر محذوف کی صفت ہے اور تقدیر عبارت یوں ہے: وَمِثْلَ هِدَايَتِنَا مَنْ نَشَاءُ جَعَلْنَاكُمْ۔ "جَعَلْنَا" کا مفعول اوّل "كُمْ" کی ضمیر ہے' جبکہ مرکب توصیفی "اُمَّةً وَّسَطًا" مفعول ثانی ہے۔ "لِتَكُوْنُوْا" پر "لامِ کَیْ" داخل ہوا ہے اس لیے "تَكُوْنُوْنَ" کا نونِ اعرابی گرا ہوا ہے۔ اس کا اسم "واو" ہے۔ "شُهَدَاءَ" اس کی خبر ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور "عَلَى النَّاسِ" متعلق خبر ہے۔ "يَكُوْنَ" کی نصب "لام کَیْ" کی وجہ سے ہے جو "لِتَكُوْنُوْا" پر آ چکا ہے اور اس کا اسم "اَلرَّسُوْلُ" ہے' جس پر لام تعریف داخل ہوا ہے۔ "شَهِيْدًا" اس کی خبر ہے اور "عَلَيْكُمْ" متعلق خبر ہے۔ "وَمَا جَعَلْنَا" کا مفعول اوّل "اَلْقِبْلَةَ" ہے جس پر لام تعریف داخل ہوا ہے جبکہ مفعول ثانی محذوف ہے۔ "اَلَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَا" کا پورا فقرہ محذوف مفعول ثانی کی صفت ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے: "وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الْقِبْلَةَ الَّتِيْ ....." یا "اَلَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَا" مذکور "اَلْقِبْلَةَ" کی صفت ہے اور مفعول ثانی محذوف ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے: "وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَا قِبْلَةً"۔ "مَا جَعَلْنَا" کا مفعول ثانی "عَلَيْهَا" کے بعد آنا تھا جسے محذوف کیا گیا ہے اور یہ "قِبْلَةً" ہو سکتا ہے۔ "اَلَّتِيْ" کے ساتھ "كُنْتَ" کا اسم "ت" ضمیر بارز ہے' اس کی خبر محذوف ہے جو کہ "قَائِمًا" ہو سکتی ہے۔ "عَقِبَيْهِ" دراصل "عَقِبٌ" کا تثنیہ "عَقِبَانِ" تھا۔ اس پر "عَلٰى" داخل ہوا تو حالتِ جر میں یہ "عَقِبَيْنِ" ہو گیا' پھر مضاف ہونے کی وجہ سے اس کا نونِ اعرابی گر گیا' جبکہ "هِ" کی ضمیر اس کا مضاف الیہ ہے۔ "وَاِنْ" میں "واو" حالیہ ہے۔ "اِنْ" دراصل "اِنَّ" ہے۔ اس کا اسم محذوف ہے۔ اَیْ والحال انها۔ "كَانَتْ" کی ضمیر "هِيَ" اس کا اسم ہے۔ اور یہ "اَلتَّحْوِيْلَةَ" (تحویل) کے لیے ہے جبکہ "لَكَبِيْرَةٌ" میں لام فارقہ ہے اور یہ "كَانَتْ" کی خبر ہے۔ "وَمَا كَانَ اللّٰهُ" میں آفاقی صداقت کا بیان ہے اس لیے "كَانَ" کا ترجمہ حال میں ہوگا۔

"قِبْلَةٌ": کعبہ کا رُخ جو نماز میں سامنے ہوتا ہے۔ سامنے کا رخ۔ محاورہ ہے: "اَيْنَ قِبْلَتُكَ" تمہارا رُخ کدھر کو ہے؟ جو چیز مُنہ کے سامنے ہو اُس کو بھی قبلہ کہتے ہیں۔ نماز پڑھنے والے کے منہ کے سامنے کعبہ ہوتا ہے اس لیے کعبہ کو بھی قبلہ کہتے ہیں۔

امام راغب نے "مفردات" میں اور پروفیسر عبدالرؤف مصری نے "معجم القرآن"

میں لکھا ہے کہ اصل لغت میں سامنے والے (مقابل) آدمی کی حالت کو قبلہ کہا جاتا تھا' مجازاً سامنے والے آدمی اور سامنے کی جہت میں اس کا استعمال ہونے لگا۔

لیکن سورۃ یونس آیت ۸۷ ﴿وَاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً﴾ سے مراد بقول سیوطی اور خازن نماز کا مقام ہے۔ فرعون نے چونکہ نماز پڑھنے کی ممانعت کر دی تھی اس لیے بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا کہ گھروں کو ہی مقامِ نماز بنالو اور چھپ کر گھروں میں ہی نماز پڑھا کرو۔ بعض غیر معتبر مفسرینِ لغاتِ قرآن نے اس آیت میں قِبْلَةً کا ترجمہ کیا ہے آمنے سامنے' یعنی اپنے مکان آمنے سامنے بناؤ تاکہ ضرورت کے وقت باہم شریک ہو سکو۔ لیکن یہ تشریح سیاقِ قرآنی کے علاوہ قدماء مفسرین کی تصریحات کے بھی خلاف ہے۔ نہ لغت اس کی اجازت دیتی ہے نہ قرینہ اس کا مقتضی ہے' اور نہ ہی واقعہ اس کی تائید کرتا ہے۔

ترجمہ

وَكَذٰلِكَ : اور اس طرح	جَعَلْنٰكُمْ : ہم نے بنایا تم لوگوں کو
اُمَّةً وَّسَطًا : ایک معتدل اُمت	لِتَكُوْنُوْا : تاکہ تم لوگ ہو جاؤ
شُهَدَآءَ : گواہ	عَلَى النَّاسِ : لوگوں پر
وَيَكُوْنَ : اور تاکہ ہو جائیں	الرَّسُوْلُ : یہ رسولؐ
عَلَيْكُمْ : تم لوگوں پر	شَهِيْدًا : گواہ
وَمَا جَعَلْنَا : اور ہم نے نہیں بنایا	الْقِبْلَةَ : اس قبلہ کو
الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَا : جس پر آپؐ تھے	اِلَّا : سوائے اس کے
لِنَعْلَمَ : تاکہ ہم جان لیں کہ	مَنْ : کون
يَتَّبِعُ : پیروی کرتا ہے	الرَّسُوْلَ : ان رسولؐ کی
مِمَّنْ : اس میں سے جو	يَنْقَلِبُ : پلٹ جاتا ہے
عَلٰى عَقِبَيْهِ : اپنی دونوں ایڑیوں پر	وَاِنْ : اور یقیناً
كَانَتْ : وہ تھی	لَكَبِيْرَةً : بھاری
اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ : سوائے ان لوگوں پر جنہیں	هَدَى اللّٰهُ : ہدایت دی اللہ نے
وَمَا كَانَ اللّٰهُ : اور اللہ نہیں ہے	لِيُضِيْعَ : کہ وہ ضائع کرے
اِيْمَانَكُمْ : تم لوگوں کے ایمان کو	اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ : یقیناً اللہ لوگوں پر
لَرَءُوْفٌ : بے انتہا نرمی کرنے والا	رَّحِيْمٌ : ہر حال میں رحم کرنے والا ہے

نوٹ (۱) : ''اِنَّ'' کی تخفیف (دوسرا نون حذف کر کے) جائز ہے۔ تخفیف کے بعد اگر اس کے بعد کوئی فعل آ جائے تو اس کو مہملہ بنانا واجب ہے۔ مثلاً ارشادِ ربانی ہے: ﴿وَاِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ﴾ (الشعراء) اور اگر اس کے بعد اسم آ جائے تو اس کو عاملہ قرار دینا قلیل اور مہملہ قرار دینا غالب و اکثر ہے۔ مہملہ کی مثال ''اِنْ اَنْتَ اِلَّا صَادِقٌ'' اور عاملہ کی مثال ''اِنْ زَيْدًا مُنْطَلِقٌ'' ہے۔

(۱) تخفیف کے بعد اگر اس کو مہملہ قرار دیا جائے تو ''اِنْ'' نافیہ اور اس کے درمیان فرق کرنے کے لیے اس کی خبر پر لامِ مفتوح لگانا واجب ہے۔ اس لام کا نام لام فارقہ ہے۔

(۲) ''اِنْ'' مخففہ کے بعد صرف افعال ناسخہ لحکم المبتدأ والخبر (افعال ناقصہ اور افعال مقاربہ) آئیں گے۔ پھر اکثر و بیشتر ان افعال کے فعل ماضی ہی کا استعمال ہوتا ہے اگرچہ فعل مضارع کا استعمال بھی جائز ہے۔ مثلاً: (۱) ﴿اِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ﴾ (آیت زیر مطالعہ) (۲) ﴿تَاللّٰهِ اِنْ كِدْتَّ لَتُرْدِيْنِ﴾ (الصّٰفّٰت) (۳) ﴿وَاِنْ وَّجَدْنَا اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ﴾ (الاعراف) مضارع کی مثال: ﴿وَاِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ﴾ (الشعراء)

نوٹ (۲) : ''كَانَ'' نافیہ (مَا كَانَ) کے بعد مضارع پر اگر ''لام'' آئے تو وہ ''لامِ جحود'' کہلاتا ہے ''لامِ كَيْ'' نہیں۔

نوٹ (۳) : وحی کی ایک قسم وہ ہے جسے قرآن مجید میں لکھ دیا گیا۔ اسے ''وحیٔ متلو'' یعنی تلاوت کی ہوئی وحی کہتے ہیں۔ وحی کی دوسری قسم وہ ہے جسے قرآن مجید میں نہیں لکھا گیا' لیکن نبی اکرم ﷺ کے اپنے اقوال و اعمال اسی وحی کی بناء پر تھے۔ اسے ''وحیٔ غیر متلو'' کہتے ہیں اور اس کا ثبوت ہمیں قرآن مجید سے ملتا ہے۔ آیت زیر مطالعہ ایسے ہی مقامات میں سے ایک ہے۔

مدینہ منورہ میں تقریباً سولہ یا سترہ مہینے حضور ﷺ نے بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھائی۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ اس کو قبلہ ہم نے بنایا تھا' لیکن قرآن مجید میں یہ حکم درج نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ آپ ﷺ کا یہ عمل وحیٔ غیر متلو کے تحت تھا۔

آیت ۱۴۴

﴿قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِی السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۪ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ﴾

ش ط ر

شَطَرَ (ن) شَطْرًا: کسی چیز کو دو برابر حصوں میں تقسیم کرنا۔

شَطْرٌ: کسی چیز کا نصف یا وسط۔ پھر کسی چیز کے رُخ یا سمت کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ آیتِ زیرِ مطالعہ۔

ح ی ث

اس مادہ سے فعل استعمال نہیں ہوتا۔

حَيْثُ: یہ ظرفِ مکان ہے اور ضمہ پر مبنی ہے۔ جہاں، کہاں (یہ زیادہ تر مکانِ مبہم کے لیے آتا ہے اس لیے اس کے بعد کسی جملہ یا فقرہ سے اس کی وضاحت کی جاتی ہے)۔ آیت زیرِ مطالعہ۔

ترکیب: ''نَرٰی'' کا فاعل اس میں شامل ''نَحْنُ'' کی ضمیر ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ لفظ ''تَقَلُّبَ'' میں حرفِ لام کی ضمہ بتا رہی ہے کہ یہ باب تفعّل کے ماضی کا صیغہ نہیں ہے، بلکہ اس کا مصدر ہے۔ مضاف ہونے کی وجہ سے تنوین سے خالی ہے۔ ''وَجْهِ'' اس کا مضاف الیہ بھی ہے اور آگے ضمیر ''كَ'' کا مضاف بھی ہے۔ یہ پورا مرکب اضافی ''نَرٰی'' کا مفعول ہے اس لیے اس کے مضاف ''تَقَلُّبَ'' پر نصب آئی ہے۔ جبکہ ''فِی السَّمَآءِ'' متعلق ''تَقَلُّبَ'' ہے۔

''لَنُوَلِّيَنَّ'' دراصل باب تفعیل میں ''وَلّٰی ۔ یُوَلِّیْ'' کا نون ثقیلہ کے ساتھ مضارع ہے اور جمع متکلم کا صیغہ ہے۔ اس میں شامل ''نَحْنُ'' کی ضمیر اس کا فاعل ہے، جو کہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ اس کے ساتھ ضمیر ''كَ'' اس کا مفعولِ اوّل ہے جبکہ ''قِبْلَةً'' مفعول ثانی ہے اور نکرہ موصوفہ ہے ''تَرْضٰىهَا'' اس کی صفت ہے۔

''فَوَلِّ'' واحد مذکر مخاطب کے صیغے میں فعل امر ہے۔ اس کا فاعل اس میں شامل

''اَنْتَ'' کی ضمیر ہے۔ مرکب اضافی ''وَجْهَكَ'' اس کا مفعول اوّل ہے اس لیے ''وَجْهَ'' پر نصب آئی ہے۔ مرکب اضافی ''شَطْرَ الْمَسْجِدِ'' مفعول فیہ (ظرف مکان) وَلِّ کے لیے۔ اس لیے ''شَطْرَ'' نصب میں ہے جبکہ ''اَلْحَرَامِ اَلْمَسْجِدِ'' کی صفت ہے۔ ''حَيْثُمَا'' وا واستینافیہ ''حَيْثُمَا'' اسم شرط جازم فی محل نصب علی الظرفیۃ۔ متعلق لمحذوف خبر ''كُنْتُمْ'' المقدم (موجودین) كُنْتُمْ ''كَانَ'' فعل ناقص ''تُمْ'' ضمیر بارز اس کا اسم۔ خبر موجودین مقدم۔ یہ سارا جملہ فعل شرط ہے اور ''فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ..... اِلٰی آخِرِہٖ'' جزا ہے۔ ''فَوَلُّوْا'' جمع مذکر مخاطب کے صیغے میں فعل امر ہے۔ اس کا فاعل ''واو'' ہے۔ ''وُجُوْهَكُمْ'' مفعول اوّل اور ''شَطْرَهٗ'' مفعول فیہ ظرف مکان ہے۔ اس میں ''ہٗ'' کی ضمیر مسجد حرام کے لیے ہے۔ یہ جملہ فعلیہ ''حَيْثُ مَا كُنْتُمْ'' شرط کی جزا ہے۔

﴿وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ﴾ میں واو استیناف ''اِنَّ'' حرف مشبہ بالفعل ''اَلَّذِيْنَ'' اسم موصول ''اُوْتُوْا'' فعل ماضی مجہول ''واو'' ضمیر بارز نائب الفاعل ''اَلْكِتٰبَ'' مفعول ثانی۔ یہ جملہ فعلیہ صلہ ہے موصول کا۔ موصول اور صلہ مل کر اس کا اسم۔ ''لَيَعْلَمُوْنَ'' میں ''لام مزحلقہ'' ہے۔ ''يَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ'' جملہ خبر یہ ہے۔ پھر ''يَعْلَمُوْنَ'' متعدی بہ دو مفعول۔ جملہ اسمیہ ''اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ'' اس کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے۔ ''اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ'' میں ''اَنَّ'' حرف مشبہ بالفعل ''ہٗ'' ضمیر اس کا اسم ''اَلْحَقُّ'' خبر ضمیر فاصل محذوف۔ ''مِنْ رَّبِّهِمْ'' جار مجرور متعلق ''كَائِنًا'' کے ساتھ یہ حال ہے ''اَلْحَقُّ'' سے۔ ''اَنَّهُ الْحَقُّ'' میں ''ہٗ'' کی ضمیر ''اَنَّ'' کا اسم ہے اور ''اَلْمَسْجِدِ الْحَرَامِ'' کے لیے ہے۔ ''اَلْحَقُّ'' خبر معرف باللام ہے اور ضمیر فاصل ''هُوَ'' کے بغیر ہے۔ پورا جملہ اس طرح ہوتا ہے: ''اَنَّهٗ هُوَ الْحَقُّ''۔

ترجمہ

قَدْ نَرٰی : ہم نے دیکھا ہے	تَقَلُّبَ وَجْهِكَ : آپ کے چہرے کا پلٹنا
فِی السَّمَآءِ : آسمان میں	فَلَنُوَلِّيَنَّكَ : تو ہم لازماً پھیر دیں گے آپ کو
قِبْلَةً : اس قبلہ کی طرف	تَرْضٰىهَا : آپ راضی ہوں جس سے
فَوَلِّ : پس آپ پھیریں	وَجْهَكَ : اپنے چہرے کو
شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ : مسجد حرام کی طرف	وَحَيْثُ مَا : اور جہاں کہیں بھی

كُنْتُمْ :تم لوگ ہو	فَوَلُّوْا :تو تم لوگ پھیرو
وُجُوْهَكُمْ :اپنے چہروں کو	شَطْرَهٗ :اس کی طرف
وَاِنَّ الَّذِيْنَ :اور بیشک وہ لوگ جن کو	اُوْتُوا الْكِتٰبَ :دی گئی کتاب
لَيَعْلَمُوْنَ :یقیناً جانتے ہیں	اَنَّهُ الْحَقُّ :کہ وہ ہی حق ہے
مِنْ رَّبِّهِمْ :ان کے ربّ سے	وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ :اور اللہ غافل نہیں ہے
عَمَّا :اس سے جو	يَعْمَلُوْنَ :یہ لوگ کرتے ہیں

نوٹ (۱) : اہل کتاب کے علماء پر یہ حقیقت پوری طرح واضح تھی کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام نے خانہ کعبہ تعمیر کیا تھا اور یہ بنو اسماعیل اور بنو اسرائیل دونوں کا قبلہ تھا۔ پھر تیرہ سو سال بعد حضرت سلیمان ؑ نے بیت المقدس تعمیر کرایا تو وہ یہودیوں کا قبلہ قرار پایا۔ لیکن اپنی کتابوں میں وہ لکھا ہوا پاتے تھے کہ ''اُس نبی'' یعنی آخری نبی (حضرت محمد ﷺ) کا قبلہ خانہ کعبہ ہوگا۔

ابوالعالیہؒ کا ایک یہودی سے مناظرہ ہوگیا۔ یہودی نے کہا کہ حضرت موسیٰ ؑ کا قبلہ بیت المقدس تھا۔ ابوالعالیہؒ نے کہا نہیں' حضرت موسیٰؑ بیت المقدس کے پاس نماز پڑھتے تھے لیکن آپؑ کا رُخ بیت اللہ کی طرف ہی ہوتا تھا (واضح رہے کہ حضرت موسیٰ ؑ کے زمانے میں بیت المقدس تعمیر نہیں ہوا تھا) یہودی نے انکار کیا تو ابوالعالیہؒ نے کہا اس جھگڑے کا فیصلہ حضرت صالح ؑ کی مسجد کرے گی جو بیت المقدس کے نیچے ایک پہاڑ پر تھی۔ دیکھا گیا تو اس کا قبلہ بیت اللہ کی طرف تھا۔ (معارف القرآن' ج ۱' ص ۳۷۵)

آیت ۱۴۵

﴿وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ۭ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾

ترکیب : ''وَلَئِنْ'' میں واو استیناف' لامِ مُوَطِّئَةٌ لِلْقَسَم ۔ ''اِنْ'' شرطیہ۔ ''اَتَيْتَ'' فعل ماضی ۔ ''تَ'' ضمیر بارز فاعل ۔ ''الَّذِيْنَ'' اسم موصول ۔ ''اُوْتُوْا'' فعل ماضی مجہول ۔ واو ضمیر بارز' نائب الفاعل ''الْكِتٰبَ'' مفعولِ ثانی ۔ ''بِكُلِّ اٰيَةٍ'' جار مجرور متعلق ''اَتَيْتَ'' کے ۔ فعل نائب الفاعل' مفعولِ ثانی اور متعلق سے مل کر جملہ فعلیہ ہو کر صلہ ہے

موصول کا۔ موصول صلہ مل کر "اِتَّبَعْتَ" کا مفعول بہ۔ فعل + فاعل + مفعول مل کر جملہ فعلیہ ہو کر شرط۔ "مَا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ" میں "مَا" نافیہ "تَبِعُوْا" فعل' واو ضمیر بارز فاعل "قِبْلَتَكَ" مفعول۔ فعل' فاعل اور مفعول بہ مل کر جملہ فعلیہ ہو کر جواب قسم ہے جواب شرط نہیں۔ کیونکہ قسم پہلے ہے اور شرط بعد میں ہے اور قاعدہ ہے: اِذَا اجْتَمَعَ شَرْطٌ وَقَسَمٌ فَالْجَوَابُ لِلْمُتَقَدِّمِ مِنْهُمَا۔ ﴿وَمَا اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ﴾ میں "واو" عاطفہ "مَا" نافیہ "اَنْتَ" "مَا" کا اسم "بِتَابِعٍ" میں "باء" حرف جر زائد "تَابِعٍ" مجرور لفظاً و منصوب محلاً' کیونکہ "مَا" کی خبر ہے۔ "قِبْلَتَهُمْ" "تَابِعٍ" کا مفعول اور یہ جملہ سابقہ جملہ پر عطف ہے۔ ﴿وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ﴾ ان کی بعینہٖ وہی ترکیب ہے جو سابقہ جملہ کی ہے۔ ﴿وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاۤءَهُمْ ......﴾ میں واو استینافیہ "ل" حرف قسم "اِنْ" حرف شرط "اِتَّبَعْتَ" فعل "تَ" ضمیر بارز فاعل "اَهْوَاۤءَ هُمْ" مفعول بہ "مِنْ" حرف جار "بَعْدِ" مضاف "مَا" موصول "جَاۤءَكَ" ضمیر مستتر هُوَ راجع ہوئے۔ "مَا" فاعل "كَ" ضمیر مفعول فیہ "مِنَ الْعِلْمِ" جار مجرور متعلق "كَائِنًا" حال ہے "جَاۤءَ" کے فاعل "هُوَ" ضمیر سے۔ فعل' فاعل' مفعول فیہ اور حال مل کر جملہ فعلیہ ہو کر مضاف الیہ بعد کا۔ مضاف + مضاف الیہ مل کر مجرور حرف جار "مِنْ" کا۔ جار مجرور متعلق "اِتَّبَعْتَ" کا۔ فعل + فاعل + مفعول بہ اور متعلق مل کر شرط۔ ﴿اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ میں "اِنَّ" حرف مشبہ بالفعل "كَ" ضمیر اس کا اسم "اِذًا" حرف جواب و جزا۔ لیکن یہاں یہ فہملہ ہے' حرف قسم کی تاکید کے لیے آیا ہے۔ "لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ" میں "ل" مزحلقہ۔ "مِنْ" حرف جر "الظّٰلِمِيْنَ" مجرور اور یہ متعلق ہے اِنَّ کی خبر کے جو محذوف ہے۔ "اِنَّ" اپنے اسم اور خبر سے مل کر جواب قسم ہے' جواب شرط (جزاء) نہیں ہے' ورنہ تو اس پر "فاء" کا استعمال کیا جاتا۔

(نوٹ) جیسا کہ ابھی ابھی گزار ہے کہ کسی جملہ میں اگر شرط اور قسم دونوں آ جائیں تو ان میں سے جو مقدم ہوگا تو بعد والا جملہ اس کا جواب ہوگا۔ اگر شرط پہلے ہے تو بعد کا جملہ جزاء ہوگا اور اس پر جزاء والے احکام لاگو ہوں گے۔ اور اگر قسم پہلے ہو تو بعد کا جملہ جواب قسم ہوگا اور اس پر جواب قسم کے احکام جاری ہوں گے۔

ترجمہ

وَلَئِنْ : اور اگر	اَتَيْتَ : آپ لے آئیں
الَّذِيْنَ : ان کے پاس جن کو	اُوْتُوا الْكِتٰبَ : دی گئی کتاب

بِکُلِّ اٰیَۃٍ : تمام نشانیاں (ہر نشانی)
مَّا تَبِعُوْا : تو بھی وہ لوگ پیروی نہیں کریں گے
قِبْلَتَکَ : آپؐ کے قبلے کی
وَمَآ اَنْتَ : اور نہ آپؐ
بِتَابِعٍ : پیروی کرنے والے ہیں
قِبْلَتَھُمْ : ان کے قبلے کی
وَمَا بَعْضُھُمْ : اور نہ اُن کے کچھ لوگ
بِتَابِعٍ : پیروی کرنے والے ہیں
قِبْلَۃَ بَعْضٍ : (اپنے) کچھ لوگوں کے قبلے کی
وَلَئِنِ : اور اگر
اتَّبَعْتَ : آپؐ نے پیروی کی
اَھْوَآءَ ھُمْ : ان کی خواہشات کی
مِّنْ بَعْدِ : اس کے بعد
مَا جَآءَ کَ : کہ جو آیا آپؐ کے پاس
مِنَ الْعِلْمِ : علم میں سے
اِنَّکَ اِذًا : پھر تو یقیناً آپؐ
لَّمِنَ الظّٰلِمِیْنَ : ظلم کرنے والوں میں سے ہوں گے

نوٹ : (۱) اس آیت میں بھی انداز وہی ہے کہ خطاب نبی ﷺ سے ہے لیکن دراصل وارننگ ہم لوگوں کو دی گئی ہے۔

(۲) : اس آیت میں بھی ''اَھْوَاءَ ھُمْ'' اور ''مِنَ الْعِلْمِ'' کا تقابلی مطالعہ ہماری راہنمائی اس حقیقت کی جانب کر رہا ہے کہ subjective thinking کے نتیجہ میں انسان جو عقائد اور نظریات قائم کرتا ہے' ان پر سائنٹیفک ریسرچ کے خواہ کتنے ہی ردے چڑھا لے' لیکن بہر حال وہ خواہشات ہی ہوتے ہیں۔ علم حاصل کرنے کا راستہ صرف ایک ہے' اور وہ یہ کہ علمِ وحی کی روشنی میں انسان اپنی objective thinking کی صلاحیت کو استعمال کرے۔ یہ بھی نوٹ کر لیں کہ اس راستے کی ضرورت واہمیت فزیکل سائنس سے زیادہ سوشل سائنس میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو قومیں آج آسمان سے تارے توڑ کر لا رہی ہیں' سوشل سائنس میں وہی قومیں آج ترقیٔ معکوس کا شکار ہیں۔ انسانیت کو تباہی سے بچانے کے لیے اس حقیقت کا ادراک کرنا اور اس کا اعتراف کرنا ازبس ضروری ہے۔ اس ضمن میں آج کے ''اہل کتاب'' یعنی اُمت وسط کی ذمہ داری دوچند ہے' کیونکہ اب علمِ وحی ہمارے پاس ہے۔ اگر ہم نے اپنا فریضہ سرانجام نہ دیا تو میدانِ حشر میں ہم شُھَدَاءَ عَلَی النَّاسِ کا فریضہ سرانجام نہیں دے سکیں گے اور بقول مولانا مودودیؒ اللہ تعالیٰ ہم سے پوچھے گا کہ جب دنیا

میں معصیت، ظلم اور گمراہی کا یہ طوفان برپا تھا تو تم کہاں مر گئے تھے۔

آیت ۱۴۶

﴿اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَاِنَّ فَرِیْقًا مِّنْهُمْ لَیَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ﴾

ترکیب : ''اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ'' مبتدأ ہے اور ''یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ'' اس کی خبر ہے۔ ''اِنَّ'' کا اسم ''فَرِیْقًا'' ہے جو نکرہ موصوفہ ہے۔ ''مِّنْهُمْ'' جار مجرور متعلق ''كَائِنًا''۔ ''كَائِنًا'' اپنے متعلق سے مل کر ''فَرِیْقًا'' کی صفت ہے۔ ''لَیَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ'' میں ''ل'' مزحلقہ ''یَكْتُمُوْنَ'' فعل یا فاعل ''الْحَقَّ'' مفعول بہ۔ ''وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ'' میں واوِ حالیہ ''هُمْ یَعْلَمُوْنَ'' جملہ فعلیہ حال۔ فعل + فاعل + مفعول بہ مل کر ان کی خبر۔

ترجمہ

اَلَّذِیْنَ : وہ لوگ	اٰتَیْنٰهُمُ : ہم نے دی جن کو
الْكِتٰبَ : کتاب	یَعْرِفُوْنَهٗ : وہ لوگ پہچانتے ہیں اس کو
كَمَا : جیسے کہ	یَعْرِفُوْنَ : وہ پہچانتے ہیں
اَبْنَآءَهُمْ : اپنے بیٹوں کو	وَاِنَّ : اور یقیناً
فَرِیْقًا : ایک ایسا فریق	مِّنْهُمْ : ان میں سے ہے
لَیَكْتُمُوْنَ : جو چھپاتا ہے	الْحَقَّ : حق کو
وَهُمْ : اس حال میں کہ وہ لوگ	یَعْلَمُوْنَ : جانتے ہیں

نوٹ (۱) : ''یَعْرِفُوْنَهٗ'' میں ''ہٗ'' کی ضمیر کو حضور ﷺ کے لیے بھی مانا گیا ہے' قرآن کے لیے بھی مانا گیا ہے اور ایک رائے یہ بھی ہے کہ یہ قبلہ کے طور پر بیت اللہ کے لیے ہے۔ میرے خیال میں یہ ضمیر اُن سب کی جامع ہے' کیونکہ حضور ﷺ کو انہی علامتوں سے پہچانا جاتا تھا اور اہل کتاب نے انہی علامتوں کے ذریعے حضور ﷺ کو اس طرح پہچان لیا تھا جیسے کوئی اپنے بیٹوں کو پہچانتا ہے۔

آیت ۱۴۷

﴿اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ﴾

م ر ی

مَرٰی (ض) مِرْیَۃً: شک کی وجہ سے جھگڑا کرنا۔

مِرْیَۃٌ (اسم ذات): شک، شبہ۔ ﴿فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ﴾ (ھود:۱۷) ''تو آپؐ نہ ہوں کسی شبہ میں اس سے۔''

مَارٰی (مفاعلہ) مِرَاءً: ایک دوسرے سے جھگڑنا۔ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُمَارُوْنَ فِي السَّاعَةِ لَفِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ﴾ (الشوریٰ) ''بیشک جو لوگ جھگڑتے ہیں اس گھڑی میں (یعنی قیامت کے بارے میں) وہ دور کی گمراہی میں ہیں۔''

لَا تُمَارِ (فعل نہی): تو مت جھگڑ۔ ﴿فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَاءً ظَاهِرًا﴾ (الکہف:۲۲) ''پس تو مت جھگڑ اُن میں مگر ظاہری جھگڑنا (یعنی سرسری اختلاف ظاہر کر دینا)''

تَمَارٰی (تفاعل) تَمَارًا: باہم کسی پر یا کسی چیز میں شک کرنا، جھگڑا کرنا۔ ﴿وَلَقَدْ اَنْذَرَهُمْ بَطْشَتَنَا فَتَمَارَوْا بِالنُّذُرِ﴾ (القمر) ''اور اس نے خبردار کیا ان کو ہماری پکڑ سے تو ان لوگوں نے جھگڑا کیا خبردار کرنے میں۔''

اِمْتَرٰی (افتعال) اِمْتِرَاءً: اہتمام سے جھگڑا کرنا، شک کرنا۔ ﴿اِنَّ هٰذَا مَا كُنْتُمْ بِهٖ تَمْتَرُوْنَ﴾ (الدُّخان) ''بیشک یہ وہ ہے جس میں تم لوگ شک کیا کرتے تھے۔''

مُمْتَرٍ (اسم الفاعل): شک کرنے والا، جھگڑا کرنے والا (آیت زیر مطالعہ)

ترکیب: ''اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ'' کی ترکیب میں میرا ذہن مولانا اصلاحی کی رائے کو ترجیح دیتا ہے کہ ''اَلْحَقُّ'' خبر معرف باللام ہے۔ اس کا مبتدأ اور ضمیر فاعل دونوں محذوف ہیں۔ پورا جملہ اس طرح ہوتا: ''هٰذَا هُوَ الْحَقُّ'' جبکہ ''مِنْ رَّبِّكَ'' متعلق خبر ہے۔ ''لَا تَكُوْنَنَّ'' واحد مذکر مخاطب کے صیغے میں ''يَكُوْنُ'' کا فعل نہی ہے، نون ثقیلہ کے ساتھ۔ اس کا فاعل اس میں شامل ''اَنْتَ'' کی ضمیر ہے۔ ''مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ'' دراصل اس کا مفعول تھا لیکن اس پر ''مِنْ'' داخل ہونے کی وجہ سے اب متعلق فعل کہلائے گا۔

ترجمہ

اَلْحَقُّ: (یہ ہی) حق ہے	مِنْ رَّبِّكَ: آپؐ کے ربّ کی طرف سے
فَلَا تَكُوْنَنَّ: پس آپؐ ہرگز نہ ہوں	مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ: شک کرنے والوں میں سے

زنجبیل

تحقیق وتحریر: سید قاسم محمود

قرآنی نام: زنجبیل — عربی: جنزبیل بھی کہتے ہیں

فارسی: زنجفل — اردو، ہندی: ادرک، سونٹھ

سنسکرت: اردرکم — انگریزی: ginger

نباتاتی نام: Zingiber Officinale Rose

قرآن مجید میں اس کا حوالہ صرف ایک آیت میں آیا ہے۔ سورۃ الدہر کی آیت ۱۷ میں یوں ارشاد ہوا:

﴿وَيُسْقَوْنَ فِيهَا كَأْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيلًا ۝﴾

''اُن کو وہاں ایسی شراب کے جام پلائے جائیں گے جن میں سونٹھ کی آمیزش ہوگی۔''

اس آیت کو اگلی آیت ۱۸ کے ساتھ ملا کر پڑھیے:

﴿عَيْنًا فِيهَا تُسَمّٰى سَلْسَبِيلًا ۝﴾

یعنی یہ جنت کا ایک چشمہ ہوگا جسے سلسبیل کہا جاتا ہے۔

ان دونوں آیات کو اسی سورۃ الدہر کی پانچویں آیت کے ساتھ ملا کر پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ تینوں آیات معانی کی ایک وحدت رکھتی ہیں:

﴿إِنَّ الْأَبْرَارَ يَشْرَبُونَ مِنْ كَأْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُورًا ۝﴾

''نیک بندے ایسے جام سے پئیں گے جس کا مزاج کافوری ہوگا۔''

مولانا امین احسن اصلاحی کی تفسیر ''تدبر قرآن'' کی طرف رجوع کیا جائے تو ''زنجبیل'' اور ''کافور'' دونوں نباتات کی کافی وضاحت ملتی ہے۔ سورۃ الدہر کی آیت ۵ کی تشریح میں مولانا صاحب لکھتے ہیں:

''یہ کافروں کے مقابل میں شاکر بندوں کے صلے کا بیان ہوا ہے اور ان کو اَبرار سے تعبیر فرمایا ہے۔ ''بِرّ'' کی اصل روح ایفائے عہد و ذمہ ہے اور لفظ ''شکر'' کی اصل حیثیت نعمت کے حق کو پہچاننا اور اس کو ادا کرنا ہے۔ ان دونوں میں واضح قدرِ مشترک موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کے جو بندے اُس کی نعمتوں کا حق پہچانتے اور اُس کو ادا کرتے ہیں' وہی دراصل اس کے شکر گزار اور وفادار بندے ہیں۔

لفظ ''کاس'' ظرف اور مظروف یعنی شراب اور جام دونوں معنوں میں آتا ہے۔

''مزاج'' کے معنی ملونی کے ہیں۔ کھانے پینے کی چیزوں میں بعض اوقات لذت' خوشبو یا اُن کے مزاج میں اعتدال پیدا کرنے کے لئے بعض چیزیں اُن کے استعمال کے وقت ملائی جاتی ہیں۔ شراب میں بھی اس طرح کی ملونیوں اور بعض دوسرے لوازم کا ذکر عرب شعراء کرتے ہیں۔ اہل جنت کی شراب میں یہ ملونی چشمۂ کافور کے آبِ زلال کی ہوگی۔

''کافور'' سے مراد یہاں معروف کافور نہیں ہے۔ قرآن نے خود وضاحت فرما دی ہے کہ یہ جنت کا ایک چشمہ ہے' جس کے کنارے بیٹھ کر اللہ کے نیک اور شکر گزار بندے شراب نوش کریں گے اور اس چشمے کے پانی کی ملونی سے اس کے کیف و سرور کو دوچند کریں گے۔ رہا یہ سوال کہ اس کا نام ''کافور'' کیوں رکھا گیا ہے' تو ناموں سے متعلق اس طرح کا سوال اگرچہ پیدا نہیں ہوتا' تاہم ذہن اس طرف جاتا ضرور ہے کہ اسم اور مسمّٰی میں کوئی مناسبت ہوگی۔ یہ مناسبت کس نوع کی ہے؟ اس کا تعلق متشابہات سے ہے۔ اس کی اصل حقیقت اُسی دن اور اُنہی خاص بندوں پر کھلے گی' جن کو اُس سے بہرہ مند ہونے کی سعادت حاصل ہوگی''۔

آیت ۱۷ اور ۱۸' جن میں ''زنجبیل'' کا حوالہ آیا ہے' اُن کی تشریح میں مولانا اصلاحی مرحوم و مغفور رقم طراز ہیں:

''اوپر (آیت ۵ اور ۶ میں) چشمۂ کافور کا ذکر ہوا۔ یہاں ایک دوسرے چشمے کا ذکر ہے۔ فرمایا کہ اس میں ایک اور شراب بھی اُن کو پلائی جائے گی جس میں چشمۂ زنجبیل کی ملونی ہوگی۔ یہ بھی جنت کے چشموں میں سے ایک چشمہ ہے' جس کا دوسرا نام ''سلسبیل'' ہے۔ ناموں سے متعلق ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ اِن میں لغوی مفہوم کا اعتبار نہیں ہوتا۔ ''زنجبیل'' کے مشہور لفظی معنی تو سونٹھ کے ہیں' لیکن نام بادنیٰ مناسبت بھی رکھے جاتے ہیں۔ جنت اور دوزخ کی کتنی ہی چیزوں کے نام قرآن مجید میں

مذکور ہیں' لیکن ان ناموں سے اُن کے مسمّٰی کی حقیقت کا صحیح علم ممکن نہیں ہے۔ ہمارے لیے یہ بہت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے ناموں سے آگاہ کر دیا۔ ان شاء اللہ ایک دن اِن کی حقیقت بھی معلوم ہو جائے گی۔ اس چشمے کا دوسرا نام ''سلسبیل'' ہے۔ زجاج کے نزدیک اس کے معنی رواں دواں کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ نام بھی محض اس کی روانی کی مناسبت سے رکھا گیا ہے' جو اس کے گوناگوں اوصاف میں سے صرف ایک ہے''۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے آیت ۱۷ اور ۱۸ کی تشریح میں ''تفہیم القرآن'' میں لکھا ہے:

''اہل عرب چونکہ شراب کے ساتھ سونٹھ ملے ہوئے پانی کی آمیزش کو پسند کرتے تھے' اس لیے فرمایا گیا کہ وہاں اُن کو وہ شراب پلائی جائے گی جس میں سونٹھ کی آمیزش ہو گی' لیکن اس آمیزش کی صورت یہ نہ ہوگی کہ اُس کے اندر سونٹھ ملا کر پانی ڈالا جائے گا' بلکہ یہ ایک قدرتی چشمہ ہوگا' جس میں سونٹھ کی خوشبو تو ہوگی' مگر اس کی تلخی نہ ہوگی' اس لیے اُس کا نام ''سلسبیل'' ہوگا۔ سلسبیل سے مراد ایسا پانی ہے جو میٹھا' ہلکا اور خوش ذائقہ ہونے کی بنا پر حلق سے بہ سہولت گزر جائے۔ مفسرین کی اکثریت کا خیال یہ ہے کہ یہاں سلسبیل کا لفظ اس چشمے کے لیے بطور صفت استعمال ہوا ہے نہ کہ بطور اسم''۔

علامہ قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی نے ''تفسیر مظہری'' (اردو) میں متعلقہ آیات کی جو تشریح کی ہے' وہ بھی قابل مطالعہ ہے۔ فرماتے ہیں:

''سونٹھ کی آمیزش والی شراب عرب کے ذوق کے لیے بہت لذیذ ہوتی تھی۔ اللہ نے بھی (انہی کے ذوق کے اعتبار سے) وعدہ فرمایا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ نے جنت کی جن چیزوں کا ذکر قرآن میں کیا ہے' اور جو نام ذکر کیے ہیں' ان کی مثال دنیا میں نہیں۔ بعض کا قول ہے کہ زنجبیل جنت کے ایک چشمے کا نام ہے جس کے پانی میں سونٹھ کا مزا ہوگا۔ قتادہؒ نے کہا: جنتی چشمے کا پانی اہل قربت کو بغیر آمیزش کے ملے گا اور باقی اہل جنت کو آمیزش کے بعد''۔

ان دو آراء کا حوالہ دینے کے بعد قاضی صاحب پانی پتی اپنی رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں:

''میں کہتا ہوں کہ اللہ نے ﴿كَأْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُورًا﴾ بھی فرمایا اور ﴿كَأْسًا

كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًا﴾ بھی فرمایا' یہ اختلاف پینے والوں کی طبعی خواہش کے پیش نظر ہوگا۔ گرم مزاج والوں کو مشروب کی خنکی پسند ہوتی ہے۔ ان کو ایسی شراب مرغوب ہوتی ہے جس میں کافور کی آمیزش ہو اور سرد مزاج والوں کو گرم مشروب پسند ہوتا ہے' اس لیے اُن کو ایسا مشروب مرغوب ہوتا ہے جس میں سونٹھ کی آمیزش ہو۔ ہر شخص کی رغبت اور طبعی خواہش جدا جدا ہے''۔

قرآن کا زنجبیل ہمارے ملک میں ادرک اور سونٹھ ہیں۔ دونوں ایک ہیں' یعنی تاثیر میں جدا جدا۔ ادرک ایک پودے کی جڑ ہے' جس کا تنا دو تین فٹ اونچا گنے کی مانند ہوتا ہے اور ان ہی جیسی لمبی لمبی پتیاں لگتی ہیں۔ پاکستان میں بھی اس کی کاشت ہوتی ہے۔ ادرک کو ایک خاص طریقے سے خشک کر کے سونٹھ بنائی جاتی ہے۔ ادرک غذا کو ہضم کرتی اور بھوک لگاتی ہے۔ بادی بلغم کو چھانٹتی اور ریاح کو خارج کرتی ہے۔ سردیوں میں ادرک کو گڑ میں ملا کر کھانے سے بدن میں گرمی پیدا ہوتی اور سردی کم لگتی ہے۔ اپھارہ' پیٹ کا درد' کھانسی' دمہ' گٹھیا جیسے بلغمی امراض میں اس کے کھانے سے فائدہ پہنچتا ہے۔ گٹھیا اور بائے کے درد کو دور کرنے کے لیے اس کا تیل بنا کر مالش کرنے سے فائدہ پہنچتا ہے۔ جو طبی فوائد ادرک کے ہیں' وہی سونٹھ کے بھی ہیں۔ (بحوالہ ''دوائیں اور جڑی بوٹیاں'' ہمدرد فاؤنڈیشن' کراچی)

ڈاکٹر اسرار احمد

کے پانچ خطبات جو سالانہ محاضرات ۱۹۹۱ء میں دیئے گئے

حقیقت ایمان

تسوید و ترتیب: مولانا ابوعبدالرحمٰن شبیر بن نور

﴿اہم موضوعات﴾ . ایمان کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم . ایمان کا موضوع
. قانونی اور حقیقی ایمان کا فرق اور ان کے ضمن میں کلامی مباحث
. ایمان و عمل کا باہمی تعلق . ایمان اور نفاق . ایمان حقیقی کے سرچشمے

اشاعت خاص: 90 روپے اشاعت عام: 50 روپے

نیکی پھیلانا اور بدی کو مٹانا

مدرس : پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ ؓ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یَقُوْلُ : ((مَنْ رَاٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ ، فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ ، فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ وَذٰلِکَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ)) [رواہ مسلم]

حضرت ابوسعید خدری ؓ سے روایت ہے' وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''تم میں سے جو شخص برائی دیکھے اسے چاہیے کہ اپنے ہاتھ سے اسے روک دے' اور اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو زبان سے اسے روک دے اور اگر اس کی بھی ہمت نہ ہو تو اپنے دل سے اسے برا جانے۔ اور یہ کمزور ترین ایمان ہے''۔

رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان سے ظاہر ہے کہ ہر مسلمان اسلام کا مبلغ ہے۔ ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ خود اسلامی تعلیمات پر عمل کرے اور دوسروں کو اس کی دعوت دے۔ اس کام میں کوتاہی کسی مسلمان کے شایانِ شان نہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ دوسروں کو برائی سے روکنا بھی اُس کے فرائض میں شامل ہے۔ اس حدیث میں بتایا گیا ہے کہ اگر تم میں سے کوئی برائی ہوتے دیکھے تو اسے چاہیے کہ وہ اسے ہاتھ سے روکے۔ یعنی اس برائی کو ختم کرنے اور روکنے کے لئے اپنی طاقت' قوت اور استعداد کو بروئے کار لائے۔ برائی کو پھلتے پھولتے دیکھنا گوارا نہ کرے بلکہ خطرات کی پروانہ کرتے ہوئے اس برائی کے راستہ کی رکاوٹ بن جائے۔ چونکہ ہر کسی میں اتنی جرأت اور ہمت نہیں ہوتی کہ وہ خطرے کا مقابلہ کر سکے یا ردِّعمل میں ہونے والے نقصان کو برداشت کر سکے تو ایسے شخص کے لئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ برائی ہوتے دیکھے تو اسے زبان سے روکے۔ یعنی برائی کو روکنے کے لئے زبان استعمال کرے۔ برائی کرنے والوں کو سمجھائے' نصیحت کرے' خدا کا خوف دلائے' نیز اس برائی پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی ناپسندیدگی واضح کرے۔

زبان سے روکنے کا دوسرا انداز قلم کا استعمال بھی ہے کہ برائی کے خلاف مضامین لکھے جائیں اور بروں کو اس برائی کے انجامِ بد سے خبردار کیا جائے۔ بعض اوقات اس راستے میں

بھی خطرات کا اندیشہ ہوتا ہے۔ برے لوگ اپنے خلاف قلم اور زبان کے استعمال کو بھی برداشت نہیں کرتے اور وہ منع کرنے والوں کے لئے طرح طرح کے منفی ہتھکنڈے استعمال کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ اس لیے کچھ لوگ زبان اور قلم کے ذریعے بھی برائی کے راستے میں رکاوٹ بننے سے گھبراتے ہیں۔ ہاں وہ اُس برائی کے خلاف نفرت کے جذبات ضرور رکھتے ہیں' دل میں اُس برائی کے مٹ جانے کی تمنا کرتے ہیں' اُن لوگوں کی تحسین کرتے ہیں جو ہاتھ اور زبان سے برائی کو روکنے میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ وہ کمزور ترین ایمان والے ہیں۔

مسلم شریف ہی کی ایک دوسری حدیث میں برائی کو فروغ دینے والوں کا ذکر کر کے آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص ان لوگوں کے ساتھ اپنے ہاتھ سے جہاد کرے گا وہ مؤمن ہے' اور جو اپنی زبان سے ان کے خلاف جدوجہد کرے گا وہ بھی مؤمن ہے اور جو اپنے دل سے اُن کے ساتھ جہاد کرے گا وہ بھی مؤمن ہے۔ اور اس کے بعد تو ایمان رائی کے دانے کے برابر بھی نہیں''۔ یعنی ایسے لوگ جن کے دلوں میں برائی دیکھ کر نفرت اور بیزاری کے جذبات پیدا نہیں ہوتے اُن کے اندر تو ایمان رائی کے دانے کے برابر بھی نہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو معاشرے کے اندر برائیاں دیکھتے ہیں مگر نہ اُن کے خلاف طاقت استعمال کرتے ہیں نہ زبان۔ اگرچہ وہ خود اُن برائیوں کا ارتکاب نہیں کر رہے ہوتے مگر برائیوں کی اشاعت کی طرف سے آنکھیں بند کیے گوشۂ عافیت میں پڑے رہتے ہیں اور برائیوں کا ارتکاب کرنے والوں کے خلاف کسی طرح کا ردِّعمل ظاہر نہیں کرتے' بلکہ اُن کے ساتھ ہم پیالہ و ہم نوالہ رہتے ہیں۔ ایسے لوگ حقیقی ایمان سے تہی دامن ہیں کہ منکرات کی ترویج و اشاعت سے ان کی پیشانی پر بل تک نہیں پڑتا۔

یوں اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ معاشرے کے اندر پیدا ہونے والے منکرات کے خلاف پسندیدہ ترین ردِّعمل یہ ہے کہ طاقت کے ذریعے اُن کے سامنے دیوار کھڑی کر دی جائے۔ اس سے کم تر درجہ یہ ہے کہ زبان اور قلم کے ذریعہ اس برائی کے خلاف جدوجہد کی جائے اور کمزور ترین رویہ جو کمزور ترین ایمان کی نشاندہی کرتا ہے' یہ ہے کہ اس برائی کو دل سے برا جانا جائے۔ اور اگر یہ جذبہ بھی نہیں تو پھر رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں۔

اگر برائی کا راستہ نہ روکا جائے تو برائی بڑھتی جائے گی اور معاشرہ تباہی کی طرف چلتا جائے گا۔ اور یہ کسی مسلمان کے لیے گوارا نہیں کہ منکرات فروغ پائیں۔ مسلمان تو رسول

اللہ ﷺ کے مشن کی تکمیل کے ذمہ دار ہیں۔ وہ تو معروف کو پھیلائیں گے اور منکرات کو مٹائیں گے۔ اور اگر وہ یہ کام نہیں کر رہے تو مؤمن کیسے ہوئے! امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یعنی نیکیوں کو فروغ دینا اور برائیوں کا قلع قمع کرنا تو ہر مسلمان کے فرائض میں شامل ہے۔ اس میں کوتاہی کیسے قابل برداشت ہو سکتی ہے! سورۃ المائدۃ میں ہے کہ:

﴿لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝﴾

''بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی روش اختیار کی ان پر حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ ﷺ کی زبان سے لعنت کی گئی۔ یہ اس لیے ہوا کہ وہ نافرمانی کرتے تھے اور حدودِ الٰہی سے تجاوز کرتے تھے (اور ان کا اصل جرم یہ تھا کہ) وہ ایک دوسرے کو شدت کے ساتھ ان برائیوں سے منع نہیں کرتے تھے جن کا وہ ارتکاب کرتے تھے۔ بہت ہی برا طرزِ عمل ہے جس پر وہ کاربند تھے''۔

اس حدیث کی روشنی میں ہمارے لیے یہ سبق ہے کہ اوّل تو ہم خود نیک کام کریں' نیکی کو فروغ دیں اور برائیوں اور نافرمانیوں سے بچیں' ساتھ ہی ساتھ برائی کے خلاف حسبِ استطاعت ردِعمل کا اظہار ضرور کریں۔ برائیوں کی اشاعت ہمارے لیے ہرگز گوارا نہ ہو۔ آج بے پردگی' عریانی' فحاشی' بے حیائی' لہو ولعب اور سود جیسی برائیوں کی بڑے پیمانے پر سرپرستی ہو رہی ہے۔ خلافِ سنت کاموں یعنی بدعات کو پھیلانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی ہر ممکن صلاحیت کو استعمال کر کے برائیوں کے قلع قمع میں مستعدی دکھائیں اور اللہ کے دین اور شریعت محمدیؐ کے ساتھ استہزاء و تمسخر کو ہرگز برداشت نہ کریں۔ اس وقت ہمارے معاشرے میں سب سے بڑا منکر اسلامی نظام کا عدم نفاذ ہے جس کی وجہ سے عدل وانصاف عنقا ہے۔ جرائم پیشہ لوگوں کو بڑے بڑے جاگیرداروں' سیاسی لیڈروں اور مقتدر شخصیتوں کی آشیرباد حاصل ہے۔ چوروں' ڈاکوؤں' لٹیروں اور دوسرے بڑے بڑے مجرموں کو سزا نہیں ملتی۔ غربت عام ہے اور عوام کی معاشی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ چنانچہ ہماری سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ ہم بھرپور انداز میں نفاذِ اسلام کے لیے کوشش کریں۔ یہ کوشش انفرادی سطح پر بھی ہو اور اجتماعی سطح پر بھی۔ اس سلسلہ میں کسی ایسی غیر سیاسی جماعت میں شامل ہونا بھی ضروری ہے جو غلبۂ دین اور نفاذِ شریعت کے لیے مثبت انداز میں کام کر رہی ہو۔

نصیحت

علامہ اقبال کی ایک نظم

تفہیم: سید قاسم محمود

میں نے اقبالؔ سے ازراہِ نصیحت یہ کہا
عاملِ روزہ ہے تو ' اور نہ پابندِ نماز
تو بھی ہے شیوۂ اربابِ ریا میں کامل
دل میں لندن کی ہوس ' لب پہ ترے ذکرِ حجاز
جھوٹ بھی مصلحت آمیز ترا ہوتا ہے
تیرا اندازِ تملق بھی سراپا اعجاز
ختم تقریر تری مدحتِ سرکار پہ ہے
فکرِ روشن ہے ترا موجدِ آئینِ نیاز
درِ حکام بھی ہے تجھ کو مقامِ محمود
پالسی بھی تری پیچیدہ تر از زُلفِ ایاز
اور لوگوں کی طرح تو بھی چھپا سکتا ہے
پردۂ خدمتِ دیں میں ہوسِ جاہ کا راز
نظر آجاتا ہے مسجد میں بھی تو عید کے دن
اثرِ وعظ سے ہوتی ہے طبیعت بھی گداز
دست پرور ترے ملک کے اخبار بھی ہیں
چھیڑنا فرض ہے جن پر تری تشہیر کا ساز
اس پہ طرّہ ہے کہ تُو شعر بھی کہہ سکتا ہے
تیری مینائے سخن میں ہے شرابِ شیراز
جتنے اوصاف ہیں لیڈر کے' وہ ہیں تجھ میں سبھی

تجھ کو لازم ہے کہ ہو اُٹھ کے شریکِ تگ و تاز
غمِ صیاد نہیں' اور پَر و بال بھی ہیں
پھر سبب کیا ہے' نہیں تجھ کو دماغِ پرواز
''عاقبت منزلِ ما' وادیٔ خاموشاں است
حالیا غلغلہ در گنبدِ افلاک انداز''

پس منظر: علامہ اقبال کے پہلے مجموعۂ کلام ''بانگِ درا'' میں شامل یہ نظم سیاسی اور مذہبی رہنماؤں پر شدید طنز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اقبال نے موجودہ عہد کی مانند اپنے عہد کے بھی ان لوگوں کا کردار منافقت اور مصلحت آمیزی پر مبنی پایا' لیکن اُن پر براہِ راست طنز کرنے کی بجائے اقبال نے اپنی ذات ہی کو ہدف بنایا ہے' اگرچہ طنز کا ہدف ہمارے یہ رہنما ہی ہیں۔ نظم کا آخری شعر حافظ شیرازی کا ہے۔ یہ نظم حافظ کے اسی شعر کی تضمین ہے۔

مشکل الفاظ: اربابِ ریا: ریا کار لوگ۔ تملّق: خوشامد۔ موجد: ایجاد کرنے والا۔ مقامِ محمود: پسندیدہ مقام۔ قرآن مجید میں رسول کریم ﷺ سے مقامِ محمود کا وعدہ کیا گیا ہے: عَسٰۤی اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا (قریب ہے کہ آپؐ کا ربّ آپ کو مقامِ محمود عطا فرمائے)۔ اس سے مراد قربِ الٰہی کا نہایت بلند مقام ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اقبال نے ''مقامِ محمود'' کے لفظی معنی پسندیدہ مقام کے علاوہ خاص قربتِ الٰہی کے معنی بھی پیش نظر رکھے ہوں۔ دست پرور: لفظی معنی ہاتھ کے پالے ہوئے۔ احسان مند۔ تشہیر: شہرت دینا۔

تشریح: میں نے اقبال سے نصیحت کے طور پر کہا کہ تو روزے بھی نہیں رکھتا اور نماز بھی نہیں پڑھتا۔ ریاکاروں کے طور طریقوں میں تو کمال حاصل کر چکا ہے۔ تیرے دل میں تو یہ ہوس بھری ہوئی ہے کہ لندن پہنچے اور زبان پر مکہ مدینہ کا ذکر رہتا ہے۔ جھوٹ بھی تو ضرور بولتا ہے' اور جب اس کے متعلق پوچھ گچھ ہوتی ہے تو عذر میں کوئی نہ کوئی مصلحت پیش کر دیتا ہے۔ تو نے خوشامد اور چاپلوسی کا جو وطیرہ اختیار کر رکھا ہے' وہ تو سراسر معجزہ اور کرامت نظر آتا ہے۔ تو تقریر کرنے کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو اسے حکومتِ وقت کی تعریف و ستائش پر ختم کرتا ہے۔ تیری روشن خیالی نے نیازمندی اور منکسر المزاجی کے نئے نئے طریقے ایجاد کر لئے ہیں۔ تو افسرانِ بالا کے دروازے کو پسندیدہ مقام سمجھتا ہے اور اُن کی خدمت میں حاضر ہونے کو اپنی عزت و تکریم کا ذریعہ جانتا ہے۔ تیری حکمت عملی واقعی بڑی پیچ دار ہے۔ کہنا چاہیے کہ پیچ و خم میں وہ ایاز کی زلف سے بھی بڑھی ہوئی ہے۔ عام لوگوں کی طرح تیرا طریقہ بھی یہ ہے کہ

عہدے اور منصب کی دنیاداری کو دین کی خدمت کے پردے میں چھپا لیتا ہے' یعنی اگرچہ تیری خواہش یہ ہوتی ہے کہ حکومت سے کوئی اونچا منصب مل جائے' لیکن قوم کے سامنے یوں ظاہر کرتا ہے کہ جیسے دین کی خدمت میں ہمہ وقت مصروف ہے۔

ہاں تو مسجد میں بھی نظر آتا ہے' لیکن عید کے دن اور مسلمانوں کو دکھانے کے لئے کہ تُو نمازی بھی ہے۔ وعظ سنتا ہے تو اُس کے اثر سے کسی قدر آنسو بھی بہا لیتا ہے۔ ملک کے اخبارات کو تُو نے اپنا ممنونِ احسان بنا رکھا ہے۔ وہ تیرے اشارے پر تیری پبلسٹی کرنا اپنا فرض خیال کرتے ہیں۔ وہ ہر وقت تیری شہرت اور نیک نامی کے گن گاتے رہتے ہیں۔ ان سب باتوں سے بڑھ کر یہ کہ تُو شعر بھی کہہ سکتا ہے۔ یہاں تک کہ تیری شاعری کی صراحی میں شیراز کی شراب بھری ہوئی ہے۔ غرض ایک رہنما میں جتنے بھی اوصاف اور خصوصیات ہونے چاہئیں' وہ سب تجھ میں موجود ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ تو عوام کی طرح اپنے لیے سعی و کوشش کو لازم نہیں سمجھتا۔ تجھے صیاد کی بھی فکر نہیں' اور تیرے بال و پَر بھی موجود ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ تجھے پرواز کا خیال نہیں آتا۔ آخر سب کی منزل قبرستان ہے۔ سب کو بالآخر مرنا ہے' لیکن جب تک موت نہ آئے' اُس وقت تک تو غلغلۂ ہنگامہ آرائی اور سعی و کاوش جاری رہنی چاہیے۔

اس نظم میں دراصل مسلمانوں کے ریاکار اور برخود غلط رہنماؤں کا خاکہ اڑایا گیا ہے' جن کے اوصاف عام طور پر یہ ہوتے ہیں:

احکامِ شریعت میں سے نماز روزے جیسے بنیادی فرائض سے لاپروائی
پرلے درجے کی ریاکاری اور مصلحت آمیزی
جھوٹ اور خوشامد
ہر حال میں حکومت کی تعریف و تحسین
حکام کی نیازمندی کو وجہِ عزت سمجھنا
پُر پیچ' دوغلی حکمت عملی
دُنیوی حرص و ہوس کو خدمتِ دین کا لبادہ پہنانا۔
وعظ سن کر ریاکاری سے آنسو بہانا۔

اخبارات کو کچھ دے دلا کر اُن کو اپنے ہاتھ میں رکھنا اور اُن سے اپنی تعریف میں مضمون لکھواتے رہنا۔

اقبال کا پیغام

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

(۱) یہ سچ ہے کہ اقبال شاعر بھی ہیں اور بہت بڑے شاعر ہیں۔ ان کا شمار دنیا کے عظیم شعراء میں ہوتا ہے' لیکن جیسا کہ خود انہوں نے بار بار کہا ہے' بنیادی طور پر وہ ایک ریفارمر یا پیغام گو شاعر ہیں۔ انہوں نے شاعری کو مقصود بالذات نہیں بنایا' بلکہ مقصود بالعرض اسے اپنے پیغام کی اشاعت کا ذریعہ بنایا۔

(۲) دوسری بات ذہن نشین کرنے کے لائق یہ ہے کہ ان کا پیغام سراسر قرآن سے ماخوذ ہے۔ انہوں نے ساری عمر قرآن ہی کی تبلیغ کی۔

اب ان دونوں دعووں کا ثبوت پیش کرتا ہوں:

آشنائے من زِمن بیگانہ رفت از خُمستانم تہی پیمانہ رفت
من شکوہِ خسروی اُو را دہم تختِ کسریٰ زیرِ پائے اُو نہم
اُو حدیثِ دلبری خواہد زِ من رنگ و آبِ شاعری خواہد زِ من
(پیامِ مشرق: پیشکش)

(میرا دوست مجھ سے ناواقف ہی رہا اور میرے میخانے سے خالی جام چلا گیا۔ میں تو اسے شاہانہ شان و شوکت دیتا ہوں اور کسریٰ کا تخت اُس کے قدموں کے نیچے رکھتا ہوں' مگر وہ مجھ سے حسن و جمال کے قصے طلب کرتا ہے اور شاعرانہ اندازِ کلام کا خواہاں ہے۔)

نہ بینی خیر ازاں مردِ فرد دست کہ بر من تہمتِ شعر و سخن بست
بجبریلِ امیں ہم داستانم رقیب و قاصد و درباں ندانم
دمے در خویشتن خلوت گزیدم جہانے لازوالے آفریدم
(گلشن راز: تمہید)

(تو اس گھٹیا آدمی میں کوئی بھلائی نہیں دیکھے گا جو مجھ پر شعر وسخن کا الزام لگاتا ہے۔ میں تو جبریل امین کا ہم داستان ہوں۔ میں کسی رقیب' قاصد اور دربان سے واقف نہیں ہوں۔ میں نے اپنے من کے اندر خلوت تلاش کر لی ہے اور لازوال جہاں پیدا کیا ہے۔)

دوسرے دعوے کا ثبوت:

گوہرِ دریائے قرآں سفتہ ام　　شرحِ رمزِ ''صبغۃ اللہ'' گفتہ ام
دارم اندر سینہ نورِ لا الٰہ　　در شرابِ من سرورِ لا الٰہ
پس بگیر از بادۂ من یک دو جام　　تا درخشی مثلِ تیغِ بے نیام!

(مسافر: خطاب بہ پادشاہِ اسلام)

(میں نے قرآن کے دریا میں سے موتی چنے ہیں اور صبغۃ اللہ کے اسرار و رموز کی شرح بیان کر دی ہے۔ میں اپنے سینہ میں لا الٰہ کا نور رکھتا ہوں اور میری شراب میں لا الٰہ کا سرور ہے۔ پس تو میرے بادہ سے ایک دو جام لے لے تاکہ تو ننگی تلوار کی طرح چمکے۔)

اقبال کو قوم سے ہمیشہ یہی شکایت رہی کہ قوم نے مجھے شاعر سمجھا اس لیے میرے پیغام کی طرف توجہ نہیں کی۔ افسوس کہ ابھی تک نہیں کی۔

بآں رازے کہ گفتم 'پے نبردند　　ز شاخِ نخلِ من خرما نخوردند
من اے میرِ اُمم داد از تو خواہم　　مرا یاراں غزلخوانے شمردند

(ارمغانِ حجاز: رسالت)

(جو راز میں نے کھولا اُس پر غور نہیں کرتے اور میری کھجور کی شاخ سے کھجوریں نہیں کھاتے۔ اے امتوں کے سردار! میں آپ سے فریاد کرتا ہوں کہ دوست مجھے غزل خواں سمجھتے ہیں۔)

میں زندگی کا پیغام دے رہا ہوں لیکن مسلمان مجھ سے لوگوں کی تاریخِ وفات کا مطالبہ کر رہے ہیں!

تو گفتی از حیاتِ جاوداں گوے　　بگوشِ مردۂ پیغامِ جاں گوے
ولے گویند ایں حق ناشناساں　　کہ تاریخِ وفاتِ ایں و آں گوے

(ارمغانِ حجاز: رسالت)

(حیرا فرمان تو یہ ہے کہ حیاتِ جاوید کے بارے میں بات کروں اور مردہ کانوں میں زندگی کا پیغام دوں' مگر یہ حق کو نہ پہچاننے والے کہتے ہیں کہ فلاں فلاں کی تاریخ وفات کہو۔)

یعنی اقبال کو مرتے دم تک قوم سے یہ شکایت رہی کہ اس نے میرے کلام کو سمجھا نہ پیغام کو۔ اس پر عمل کرنا تو خارج از بحث ہے۔ یہ دونوں رباعیات وفات سے چند ماہ پہلے کی ہیں۔

در بود و نبود من اندیشہ گمانہا داشت از عشق ہویدا شد' ایں نکتہ کہ ہستم من

(پیامِ مشرق: مئی باقی)

(میرے ہست و بود میں بہت سے گمان ہیں۔ عشق سے مجھے یہ نکتہ ملا کہ میں بھی ہوں۔)

اقبال فہمی کے لیے فارسی دانی اور علمی مذاق شرط ہے۔ لیکن قوم کا مذاق اب علمی نہیں بلکہ "فلمی" ہے اور فارسی کا مطلب ہے تضیعِ اوقات!

(۳) اب تیسرا نکتہ' ان کا کارنامہ کیا ہے۔

چو رومی در حرم دادم اذاں من ازو آموختم اسرارِ جاں من!
بہ دورِ فتنۂ عصرِ کہن ' او بہ دورِ فتنۂ عصرِ رواں' من

(ارمغانِ حجاز: رسالت)

(رومی کی طرح میں نے حرم میں اذان دے دی اور میں نے اُس سے زندگی کے اسرار سیکھے۔ وہ پہلے زمانے کے فتنہ کے تدارک کے لیے تھا' اور میں دورِ حاضر کے فتنے کے مقابلے کے لیے ہوں۔)

(۴) چوتھا نکتہ: فتنۂ عصرِ رواں کیا ہے؟ (تاکہ اقبال کا مقام واضح ہو سکے!) عقلِ انسانی' معیارِ حق و باطل ہے۔ جسے عقلِ انسانی حق قرار دے وہ حق ہے ورنہ باطل ہے۔ جدید فلسفے کی مختلف صورتیں ہیں:

Positivism, Emprieism, Naturalism, Logical Positivism, Phenomenonism, Agnosticism, Scepticism, Existantialism, Marxism, Dialectical Materialism, Secularism and Humanism etc.

لیکن وہ اپنی روح کے اعتبار سے خدا' نفسِ ناطقہ اور آخرت تینوں کے خلاف ہے' یا لاادری ہے' یا بے تعلق ہے' یا ان کو لغو سمجھتا ہے۔ جدید فلسفہ اور جدید سائنس دونوں دین

کے خلاف ہیں ۔

یورپ از شمشیرِ خود بسمل فتاد زیر گردوں رسمِ لا دینی نہاد
(پس چہ باید کرد)

(یورپ اپنی ہی تلوار سے کٹ کر تڑپ رہا ہے' اُس نے آسمان کے نیچے لادینی یعنی سیکولرازم کو رائج کیا۔)

(۵) اقبال کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اس زہر کا وہی تریاق مہیا کیا ہے جو رومی نے اپنے زمانے میں کیا تھا۔

(۶) وہ تریاق کیا ہے؟ عشق۔ یعنی عقل کے بجائے عشق کو اپنا رہنما بناؤ!

(۷) اس کے لیے شانِ فقر پیدا کرنی لازمی ہے' کیونکہ عشق صرف شانِ فقر پیدا کرنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اسی کو اقبال علمِ قلندری یا نشۂ درویشی یا ایمانِ کامل سے تعبیر کرتے ہیں۔

(۸) پیغامِ اقبال: اپنے اندر شانِ فقر پیدا کرو' یہ فقر ہے کیا؟ ۔

جز بقرآں ضیغمی روباہی است فقرِ قرآں اصلِ شاہنشاہی است
فقرِ قرآں؟ اختلاطِ ذکر و فکر فکر را کامل نہ دیدم جز بہ ذکر!
(جاوید نامہ: پیغام)

(قرآن کے بغیر شیر بھی گیدڑ بن جاتا ہے اور اصل بادشاہی قرآن کے تعلیم کردہ فقر میں ہے۔ جانتے ہو کہ یہ قرآن کا فقر کیا ہے؟ یہ ذکر اور فکر دونوں کے جمع ہونے سے وجود میں آتا ہے اور حقیقت یہی ہے کہ بغیر ذکر کے فکر کامل نہیں ہو سکتا۔)

ذکر اور فکر دونوں قرآن کی اصطلاحیں ہیں۔

﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا﴾

''زمین اور آسمانوں کی پیدائش میں اور رات اور دن کے باری باری سے آنے میں ان ہوشمند لوگوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں جو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے' ہر حال میں اللہ کا ذکر کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی ساخت میں غور و فکر کرتے ہیں (وہ بے اختیار بول اٹھتے ہیں) پروردگار' یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے۔''

آپ نے دیکھا! غور کیا! اقبال کا پیغام قرآن سے ماخوذ ہے۔ آنحضرت ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم میں یہی شانِ فقر پیدا کر دی تھی۔ صدیق اکبر اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہما اس کی نمایاں اور مشہور ترین تاریخی مثالیں ہیں۔ مملکت کا رقبہ ۲۲ لاکھ مربع میل' لیکن قمیص پر پیوند لگے ہوئے ہیں اور بیوہ عورتوں کا سودا سلف بازار سے خرید کر لا رہے ہیں' بس یہی ہے شانِ فقر۔ خودی عشق سے مستحکم ہوتی ہے اور عشق سے عشقِ رسول ﷺ مراد ہے۔

کیمیا پیدا کن از مشتِ گلے بوسہ زن بر آستانِ کاملے
در دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰؐ است آبروئے ما زنامِ مصطفیٰؐ است
در شبستانِ حرا خلوت گزید قوم و آئین و حکومت آفرید
از کلیدِ دیں درِ دنیا کشاد ہمچو اوؐ بطنِ اُم گیتی نزاد

(اسرارِ خودی: عشق)

(خاک کی مٹھی سے کیمیا پیدا کر' کسی کامل کے آستانے کو بوسہ دے۔ مصطفیٰ ﷺ کا مقام مسلمان کے دل میں ہے اور ہماری آبرو مصطفیٰ ﷺ ہی کے نام سے ہے۔ آنحضور ﷺ نے حرا کی تاریک غار میں تنہائی اختیار کی۔ آپؐ نے ایک قوم پیدا کی' ایک آئین بنایا اور حکومت قائم کی۔ آپؐ نے دین کی چابی کے ساتھ دنیا کا دروازہ کھولا۔ اس زمین نے آپ ﷺ جیسا کوئی دوسرا پیدا نہیں کیا۔)

(۹) شانِ فقر پیدا کرنے کا قرآنی پروگرام بیان کرنے سے پہلے ایک اہم نکتہ اور واضح کر دوں۔ غالباً اقبال کی وفات سے سال بھر پہلے میں نے ان سے پوچھا تھا کہ آپ کے فلسفۂ خودی کا قرآنی ماخذ کیا ہے' یعنی یہ فلسفہ کون سی آیت سے ماخوذ ہے؟ انہوں نے جواب دیا: سورۃ المائدۃ کی اس مشہور اور اہم آیت سے: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْكُمْ اَنْفُسَكُمْ﴾ ''اے مسلمانا! محافظت کنید خویشتن را!'' تم پر اپنی خودی کی حفاظت فرض ہے۔ یعنی دیکھتے رہو یا نگرانی کرتے رہو کہ وہ ضعیف نہ ہو جائے:

Guard your souls ..... take care of yours.

(۱۰) اب میں شانِ فقر پیدا کرنے کا قرآنی یا اقبالی پروگرام درج کرتا ہوں:

کیفیت ہا خیزد از صہبائے عشق ہست ہم تقلید از اسمائے عشق!
عاشقی؟ محکم شو از تقلیدِ یار تا کمندِ تو شود یزداں شکار
اندکے اندر حرائے دل نشیں ترکِ خود کن' سوئے حق ہجرت گزیں

محکم از حق شو سوئے خود گام زن لات و عزائے ہوس را سر شکن!
لشکرے پیدا کن از سلطانِ عشق جلوہ گر شو برسرِ فارانِ عشق
تا خدائے کعبہ بنوازد ترا
شرح اِنّی جَاعِلٌ سازد ترا
(اسرارِ خودی: عشق)

(عشق کی شراب سے مختلف کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں۔ تقلید بھی عشق کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ کیا تو عشقِ رسولؐ کا مدعی ہے؟ اگر ہے تو پھر محبوب کی تقلید کر کے محکم ہو جا' تا کہ تیری کمند یزداں کو شکار (گرفتار) کر سکے۔ تھوڑی دیر دل کی حرا میں بیٹھ۔ اپنے آپ کو خیر باد کہہ دے اور حق کی طرف کوچ کر۔ حق کو اختیار کر کے مضبوط ہو جا اور اپنی طرف چل پڑ اور حرص و ہوا کے لات اور عزیٰ کا سر توڑ دے۔ عشق کے سلطان سے لشکر بنا اور فارانِ عشق کی چوٹی پر جلوہ گر ہو جا! تا کہ خدائے کعبہ تجھ پر نوازش فرمائے اور تجھے اِنّی جَاعِلٌ کی شرح بنا دے۔ یعنی خلیفۃ اللہ فی الارض کے مقام پر فائز فرما دے۔)

حرفِ آخر

یہ استحکامِ خودی کا 8 Fold Program ہے۔ اسی پروگرام کا خلاصہ ''زبورِ عجم'' میں بیان کر دیا گیا ہے' جسے 4 Fold پروگرام کہہ سکتے ہیں!

با نشۂ درویشی در ساز و دما دم زن چوں پختہ شوی خود را' بر سلطنتِ جم زن!

یعنی جب تمہاری خودی عشقِ رسولؐ کی بدولت مستحکم (پختہ) ہو جائے تو اللہ کا نام لے کر ملوکیت اور قیصریت کے خلاف اعلانِ جنگ کر دو' یا بالفاظِ من ''باطل سے ٹکرا جاؤ!'' اور اللہ نے تمہیں قرآن میں مطلع کر دیا ہے کہ:

﴿اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا﴾

''یقیناً باطل تو ہے ہی مٹ جانے والا۔''

اور یہ بھی اطمینان دلایا ہے کہ:

﴿وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾

''اور تم ہی (دنیا میں) سربلند ہو گے اگر تم مؤمن ہو۔''

تقریر تو ختم ہوگئی اب مرثیہ سن لیجئے۔

اللہ تعالیٰ نے سورۃ المزمل میں تزکیۂ نفس یا استحکامِ خودی کا 8 Fold Program ہمیں عطا فرمادیا ہے اور یہ پانچویں وحی ہے:

(۱) ﴿قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا﴾ (۲) ﴿وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا﴾ (۳) ﴿وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ﴾ (٤) ﴿وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا﴾ (٥) ﴿فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا﴾ (٦) ﴿وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ﴾ (٧) ﴿وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا﴾ (٨) ﴿وَذَرْنِىْ وَالْمُكَذِّبِيْنَ اُولِى النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيْلًا﴾

نوٹ:

بیسویں صدی میں ہندوؤں میں کئی ریفارمر پیدا ہوئے' مثلاً: (۱) آروِند وگھوش (وفات ۱۹۵۰ء)' (۲) رابندر ناتھ ٹیگور (۱۹۴۱ء)' (۳) شردھانند (۱۹۲۷ء)' (۴) گاندھی (۱۹۴۸ء)' (۵) تلک (۱۹۲۰ء)' (۶) گوکھلے (۱۹۱۵ء)' (۷) لالہ ہنس راج' (۸) پنڈت گورودت ودیارتھی' صاحب جی مہاراج + رادھا سوامی ست سنگ (آگرہ)' (۹) مہادیو گووند راناڈے (۱۰-۱۱) جی۔کے۔بی تلک

ہندوؤں نے ان سب مصلحین کی تعلیمات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے آشرم اور تربیت گاہیں قائم کردیں' مثلاً کانگڑی میں گروکل' شانتی نکیتن (بنگال)' دیال باغ (آگرہ)' برہموسماج آشرم (لاہور)' سابرمتی آشرم احمد آباد + ودیاپٹھ احمد آباد!!

National University, Ahmadabad. Servants of Indian Society, Poona. Bhandarkar Research Institute, Poona. Vedanta Ashrama, Pondicherry. Dayal Bagh Agra.

گورودت بھون لاہور' ہنس راج ہال لاہور' بریڈلاء ہال لاہور' لاجپت رائے ہال لاہور۔

لیکن مسلمانوں نے اقبال کی تعلیمات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے گزشتہ بیالیس سال[1] میں ایک ادارہ بھی قائم نہیں کیا' جہاں پہلے کلام اقبال کو پڑھایا جائے' پھر اسے سمجھا اور سمجھایا جائے' پھر اس پر عمل کرنے کا طریقہ بتایا جائے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم مسلمانانِ پاکستان اقبال کو صرف ایک شاعر سمجھتے ہیں۔ اس لیے:

آشنائے من ز من بیگانہ رفت از خمستانم تہی پیمانہ رفت

---

(۱) واضح رہے کہ یہ مقالہ ۱۹۸۰ء کا ہے۔

(میرا دوست مجھ سے ناواقف ہی رہا اور میرے میخانے سے خالی جام چلا گیا۔)

خطاب بہ نژادِ نو

اقبال نے جاوید نامہ میں نوجوانوں سے خصوصیت کے ساتھ خطاب کیا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ نوجوانوں میں سے گزشتہ ۴۸ سال میں کسی نے بھی اسے نہیں پڑھا اور اگر کسی نے پڑھا بھی تو اس پر عمل نہیں کیا۔ میں یہاں اس طویل خطاب میں سے جو ص ۲۳۳ سے ص ۲۴۶ تک پھیلا ہوا ہے' آخری نصیحت پیش کرنا چاہتا ہوں:

رقصِ تن در گردش آرد خاک را رقصِ جاں برہم زند افلاک را!
علم و حکم از رقصِ جاں آید بدست ہم زمیں ہم آسماں آید بدست!
فرد از وے صاحبِ جذبِ کلیم! ملت از وے وارثِ ملکِ عظیم!
رقصِ جاں آموختن کارے بود غیرِ حق را سوختن کارے بود
تا ز نارِ حرص و غم سوزد جگر جاں بہ رقص اندر نیاید اے پسر!
اے مرا تسکینِ جانِ ناشکیب تو اگر از رقصِ جاں گیری نصیب
سرِّ دینِ مصطفیٰ گویم ترا
ہم بقبر اندر دعا گویم ترا!

(جاوید نامہ: خطاب بہ جاوید)

(جسم کا رقص مٹی کو حرکت میں لے آتا ہے۔ جان کا رقص افلاک کو تہہ و بالا کر دیتا ہے۔ جان کے رقص سے علم و حکمت ملتے ہیں' بلکہ زمین و آسمان ہاتھ آ جاتے ہیں۔ فرد اس سے صفاتِ کلیمی کا حامل ہو جاتا ہے اور قوم اس سے ملکِ عظیم کی وارث بن جاتی ہے۔ جان کا رقص سیکھنا بڑا کام ہے۔ اسی طرح غیر حق کو نابود کرنا بھی بڑا کارنامہ ہے۔ اے بیٹے! اس وقت تک جان رقص میں نہیں آتی جب تک حرص و غم کی آگ جگر کو نہ جلائے۔ میری بے چین جان کو سکون مل جائے اگر تجھے جان کے رقص کا کچھ حصہ نصیب ہو جائے۔ میں تجھے دینِ مصطفیٰ ﷺ کا راز بتا رہا ہوں اور اپنی قبر کے اندر بھی تیرے لیے دعا گو ہوں۔)

اقبال کا پیغام یہ ہے کہ جسمانی کے بجائے روحانی رقص سیکھو' یعنی اپنی روح کو رقص میں لاؤ کہ یہی سرِّ دینِ مصطفیٰ ﷺ ہے۔ لیکن مسلمانوں نے آج تک کوئی ایسی تربیت گاہ قائم نہیں کی جس میں روح کو رقص کرنا سکھایا جا سکے۔ (باقی صفحہ 61 پر)

اموالِ حرام کا مصرف

یعنی بینکوں وغیرہ کے منافع کو کہاں استعمال کیا جائے؟

فتویٰ: ڈاکٹر یوسف القرضاوی

مترجم: حافظ عبدالرب سرہندی

ایک سائل نے جناب ڈاکٹر یوسف القرضاوی کا ایک مقالہ پڑھا جو بینکوں کے سود سے حاصل کیے ہوئے مال کے بارے میں تھا کہ وہ حرام ہے۔ اس پر سائل نے خود اپنے اور عامۃ المسلمین کے استفادہ کے لیے ان کو مندرجہ ذیل خط لکھا:

میں نے آپ کا مضمون بعنوان ''بینک کا منافع حرام اور سود ہے'' پڑھا اور میں نے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ نیز فقہائے کرام کے اقوال کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ چنانچہ اب میں نے یہ طے کر لیا ہے کہ میں حلال ہی کو ترجیح دوں اور حرام سے بچوں' پاکیزگی اختیار کروں' گندگی سے دُور رہوں' نیز شک کے بجائے یقین کو اپناؤں۔ درحقیقت حلال کم بھی ہو تو برکت لاتا ہے اور یہی دنیا و آخرت میں بہتر ہے اور فائدہ مند بھی اُس حرام سے جو بظاہر مقدار میں زیادہ نظر آئے۔

اب میرا سوال اس منافع کے متعلق ہے جو بینکوں میں جمع ہے' اس کا میں کیا کروں؟ کیا میں اس کو بینک ہی میں چھوڑ دوں کہ وہ جو چاہیں کریں' یا میں خود لے کر حکومت کی طرف سے عائد کردہ ٹیکس اور کسٹم ڈیوٹی وغیرہ ادا کرنے میں صرف کر دوں' یا پھر گیس اور پٹرول کا خرچ اس سے چلاؤں' جیسا کہ بعض لوگوں کا مشورہ ہے' یا پھر وہ محتاجوں میں تقسیم کر دوں اور دوسرے بھلائی کے کاموں میں بطور عطیات دے دوں' مگر حدیث میں تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خود بھی پاک ہے اور پاک چیز ہی قبول فرماتا ہے۔ آنجناب محترم سے توقع ہے کہ اس اہم مسئلہ پر راہنمائی فرمائیں کہ میں کیا کروں۔ یہ بہت سارے لوگوں کا نہایت اہم مسئلہ ہے جن کے لاکھوں کروڑوں کے سود کی حرام رقمیں اسی طرح بینکوں میں جمع ہیں اور وہ تائب ہو کر پاکیزگی اختیار کرنا

چاہتے ہیں کہ وہ ایسے گندے مال کو ٹھکانے لگا کر دنیا سے اس طرح رخصت ہوں کہ ان کی توبہ بارگاہِ الٰہی میں قبول ہو چکی ہو۔

آپ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ دین کی حمایت میں لوگوں کی نفع بخش رہنمائی فرمائے۔ آمین!

جواب

اللہ تعالیٰ سے میری دعا ہے کہ وہ اس محترم بھائی کے قدم حق پر اس طرح جما دے کہ حرام سے ہٹ کر حلال ہی اس کو بالکل کافی ہو جائے اور وہ اطاعت کر کے اللہ کا فضل پائے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اُمت کی بڑی اکثریت نیکی اور بھلائی کا مزاج رکھتی ہے اور وہ مخالفانہ فتووں اور بے لگام باتوں میں نہیں آتی' جن کے خلاف پہلے ہی علمی مجلسیں اور اسلامی ممالک میں قائم ہونے والی عالمی کمیٹیاں متفق ہیں کہ ایسے تمام منافع سود اور حرام ہیں۔

چنانچہ اس بھائی نے بینک کے جس منافع کے بارے میں دریافت کیا ہے جو اس کے نام پر جمع ہو گیا ہے تو یہ حاصل شدہ مال حرام ہے' اس کا استعمال اس کے لیے جائز نہیں اور اکلِ حرام ہے' خواہ اس کا استعمال کھانے پینے میں ہو یا لباس و رہائش میں ہو' مسلمانوں' غیر مسلموں کے حقوق کی خوشی یا مجبوری سے ادائیگی کے لیے ہو یا ٹیکسوں کی معقول یا ظالمانہ ادائیگی میں' کیونکہ بہرحال اس کو اس کا فائدہ پہنچتا ہے۔ اسی طرح ایندھن کے لیے بھی درست نہیں' اگرچہ بعض دانشوروں کی طرف سے اس کی وکالت کی جائے' یا عوامی بیت الخلاء اور پیشاب خانے تعمیر کرنے میں' جو کہ عجیب سا فتویٰ ہے' کوئی عقل سلیم اسے قبول نہیں کرتی۔ کیونکہ وہ خرچ کرنے والا اس سے کسی نہ کسی طور فائدہ پا لیتا ہے جو کہ مالِ حرام سے ناجائز ہے' اپنے لیے بھی اور اپنے اہل وعیال کے لیے بھی' اِلّا یہ کہ وہ شخص محتاج یا مقروض ہو جائے اور زکوٰۃ کا مستحق قرار پائے۔ لیکن یہ منافع بینکوں کے لیے بھی چھوڑ دینا صحیح نہیں' کیونکہ بینک اس کو لے کر اپنے سودی کاروبار کو مزید بڑھانے اور مضبوط کرنے میں لگائے گا۔ یہ عمل حرام کی مدد اور گناہ کو پھیلانے میں اعانت کا مترادف ہے۔ وضاحت کے لیے ہماری کتاب ''اسلام میں حلال وحرام'' کا مطالعہ کریں۔

اس موقع پر یہ گناہ اور زیادہ بڑا ہو جاتا ہے جب مسلمانوں کے مالدار لوگ اپنی رقمیں غیر ملکی امریکی اور یورپی بینکوں میں چھوڑ دیتے ہیں جو زیادہ افسوس ناک صورت حال ہے' کیونکہ وہ بینک ایسے زائد اموال کو اپنے رفاہی اداروں کی مدد کے لیے بھیج دیتے ہیں' زیادہ تر غیر مسلم مشنری اداروں' گرجاؤں کے لیے' جو زیادہ تر مسلمان ملکوں میں قائم ہیں' جس کا

صاف مطلب یہی ہے کہ مسلمانوں کا مال ہی مسلمانوں کو عیسائی بنانے' اپنے دین میں فتنہ پردازی کرنے اور اپنے مقصد سے دور کرنے میں استعمال کیا جائے۔

خلاصہ یہی ہوا کہ سودی منافع بینکوں میں چھوڑ دینا' خصوصاً غیروں کے بینکوں میں' قطعاً ناجائز ہے۔ یہ عالمِ اسلامی کی اکثر مجالس کا فیصلہ ہے' خاص طور پر اسلامی مصارف کی کویتی کمیٹی میں طے کر دیا گیا ہے۔ تاہم شرعی مصرف بینکوں کے سودی منافع کا' اور اس طرح کے تمام ناجائز و حرام اموال کا یہی ہے کہ رفاہی کاموں میں صرف ہوں' جیسے محتاج' مساکین' یتامیٰ اور مسافرین۔ نیز راہِ خدا کے جہاد میں' اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں' مساجد اور اسلامی مراکز کی تعمیر میں' مبلغوں اور واعظوں کی تیاری میں اور اسلامی مطبوعات وغیرہ مختلف قسم کے بھلائی کے کاموں میں خرچ کیے جائیں۔

اسلامی تحقیق کی مجلسوں میں اس پر بحث و مذاکرہ ہو چکا ہے اور بعض علماء حضرات اس کے متعلق اپنی رائے محفوظ رکھتے ہیں کہ یہ سودی حرام منافع محتاجوں اور اسلامی رفاہی اداروں کے لیے کیونکر جائز ہو جائے گا جبکہ ہم خود اس کو خبیث' گندا اور اپنے لیے ناگوار سمجھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مال بذاتِ خود مکروہ اور گندا صرف اس شخص کے لیے ہے جس کے پاس غلط کمائی سے آیا ہے' لیکن یہ محتاجوں اور فلاحی کاموں کے لیے جائز ہے' یعنی کمانے والے کے لیے ناجائز طریقہ ہونے کے سبب حرام ہے' جبکہ مذکورہ فلاحی امور کے لیے صحیح ہے۔ چنانچہ مال بذاتِ خود گندا نہیں' وہ تو خاص سبب اور خاص شخصیت کے اعتبار سے حرام ہوتا ہے۔

اگر اس حرام مال کو خرچ کرنے کے لیے مختلف طریقوں پر غور کیا جائے تو وہ صرف چار ہی ہو سکتے ہیں:

(ا) : کمانے والا یہ مال خود بھی استعمال کرے اور اپنے اہل و عیال پر بھی صرف کرے۔ یہ ناجائز ہے' جیسا کہ بیان ہو چکا ہے۔

(ب) : یہ مال سودی کاروبار والے بینک میں ہی چھوڑ دیا جائے۔ یہ بھی صحیح نہیں۔ اس کا ذکر بھی گزر چکا۔

(ج) : اس مال کو لے کر تلف کر کے ضائع کر دیا جائے۔ یہ مشورہ بعض گزرے ہوئے متقی علماء نے دیا تھا' لیکن امام غزالی نے اپنی کتاب ''احیاء علوم الدین'' میں اس کی تردید کی۔ حدیث میں بھی ہے کہ ہمیں مال کو ضائع کرنے سے منع فرمایا گیا ہے۔

(د) : اس مال کو رفاہی اور فلاحی کاموں میں استعمال کیا جائے' یعنی محتاجوں' مساکین'

یتیموں اور مسافروں کی ضروریات کے لیے' نیز رفاہی اداروں اور اجتماعی دعوت وتبلیغ کے لیے۔ چنانچہ ناجائز طریق پر حاصل ہونے والے مال کا یہی متعین وصحیح مصرف ہے کہ خود کمانے والا بھی گناہ سے محفوظ رہے اور مال صحیح مصرف میں استعمال بھی ہو جائے۔

مناسب ہے کہ یہاں یہ حقیقت بھی واضح ہو جائے کہ یہ عمل صدقہ وخیرات کے طور پر نہیں کیا جائے گا' کیونکہ ''اللہ تعالیٰ خود پاک ہے اور اس کی بارگاہ میں صدقہ بھی پاک ہی قبول کیا جاتا ہے''۔ یہ تو دراصل غلط مال کو صحیح طریقہ پر ایک ہی مصرف میں استعمال کا جواز بیان کرنا مقصود ہے' تاکہ ایسا مال رکھنے والا خود کو صدقہ کرنے والا سمجھنے کے بجائے اس مال کو صحیح بھلائی کے مصرف تک پہنچانے والا بن جائے۔ ویسے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ اُس شخص کی طرف سے صدقہ کرنے والا ہے جس کا درحقیقت یہ مال ہے اور وہ اس کا مالک ہے۔

بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ بینکوں کے یہ منافع دراصل ان قرض داروں کی ملکیت ہیں جو بینک سے اپنی بعض ضرورتوں کے لیے قرض حاصل کرتے ہیں' چنانچہ یہ درحقیقت ان ہی کو ملنے بھی چاہئیں' جبکہ بینک کے ساتھ قرض داری کے معاہدہ کی رو سے وہ اس سے محروم رہ جاتے ہیں۔ پھر یہ زائد مال یا منافع صحیح مالک کے معلوم نہ ہونے کی وجہ سے بینک میں ہی چھوٹے رہ جاتے ہیں۔

امام ابوحامد غزالی کے نزدیک ایسے اموال جن کے مالک معلوم نہ ہوں یا ان کو دریافت کرنا ممکن نہ ہو کہ ان کو یہ اموال واپس کیے جاسکیں اور حقیقت واضح ہونے تک توقف کو کہا جائے اور عام طور پر بہت سارے مالکوں کی وجہ سے یہ لوٹائے نہ جاسکیں' جیسے مشتبہ قسم کا مالِ غنیمت جمع ہو جاتا ہے' تو ایسے اموال کو اصل نامعلوم مالکوں کی طرف سے صدقہ کر دینا ہی مناسب ہے۔ امام غزالی نے یہ کہا ہے کہ اس کے بارے میں سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اس مالِ حرام کا صدقہ کیسے ہو جس کا کوئی مالک بھی معلوم نہ ہو؟ اسی وجہ سے ایک جماعت اس صدقہ کو ناجائز کہتی ہے کہ یہ مال حرام ہے۔

صوفی فضیل بن عیاض کی ایک حکایت ہے کہ ان کو جو درہم ملے جب ان کو معلوم ہوا کہ یہ ایسے ہی ہیں تو انہوں نے وہ پھینک دیئے اور کہا میں صدقہ تو پاکیزہ مال کا ہی کروں گا' کیونکہ جو میں اپنے لیے پسند نہیں کرتا وہ دوسرے کے لیے کیوں پسند کروں؟ ہمارا کہنا یہ ہوگا کہ ہم نے ان کے خلاف یہ رائے خاص سبب اور معقول احتمال کی وجہ سے اختیار کی ہے۔ یعنی حدیث اور صحابہ کے عمل کے اتباع میں صحیح قیاس کے ساتھ۔ حدیثِ مبارکہ ہے کہ جناب نبی

اکرم ﷺ کو ایک مرتبہ ایک بھنی ہوئی بکری کا گوشت پیش کیا گیا تو جب آپ کو معلوم ہوا کہ یہ حرام ہے تو آپؐ نے اسے صدقہ کر دینے کا حکم دیا۔ اسی طرح اہل روم کی فتح کی جب اللہ تعالیٰ نے قرآن میں پیشین گوئی فرمائی تو مشرکین مکہ نے جھٹلایا اور مذاق اڑایا کہ ''دیکھو تمہارا صاحب (نبیؐ) کیسی عجیب بات کہہ رہا ہے! اس کو زعم ہے کہ رومی غالب آ جائیں گے''۔ اس پر جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں سے شرط باندھ لی۔ پھر جب یہ بات سچ ثابت ہوئی اور شرط کا مال حضرت ابوبکرؓ نبی اکرم ﷺ کے پاس لائے اور آپؐ نے اس کو حرام بتایا تو انہوں نے اس کو صدقہ کر دیا۔ تب ہی شرط لگانے اور جوا کھیلنے کی حرمت نازل ہوئی۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل

۱) جناب عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک کنیز خریدی۔ اس کے مالک کو وقت پر قیمت نہ دے سکے۔ اس نے بعد میں زیادہ طلب کرنا چاہا تو جناب ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس کی قیمت صدقہ کر دی اور دعا کی ''اے اللہ! یہ اس کی طرف سے صدقہ ہے اگر وہ راضی ہو ورنہ میری طرف سے صدقہ ہے''۔

۲) حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے کسی نے مسئلہ پوچھا کہ مالِ غنیمت میں سے چوری کرنے والے کی توبہ کیسے قبول ہوگی؟ تو آپؒ نے فرمایا کہ ''وہ اسے صدقہ کر دے''۔

۳) ایک روایت یہ بھی ہے کہ ایک شخص نے کسی موقع پر مالِ غنیمت میں سے سو دینار چوری کر لیے، پھر جب احساس ہوا تو واپس جمع کرانے اپنے سردار کے پاس آیا جس نے یہ کہہ کر لینے سے انکار کر دیا کہ اب تو لوگ واپس چلے گئے۔ پھر وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس آیا تو انہوں نے بھی انکار کر دیا۔ تب وہ کسی اور نیک آدمی سے ملا جس نے مشورہ دیا کہ اس کا پانچواں حصہ امیر معاویہؓ کو (بیت المال کے لیے) دے دو اور باقی صدقہ کر دو۔ یہ بات امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوئی تو آپؓ نے قبول کر لیا کہ پھر کوئی اندیشہ نہ رہا تھا۔

امام احمد بن حنبلؒ، حارث محاسبی اور صوفیاء کی ایک جماعت نے بھی یہی رائے اختیار کی ہے۔

قیاس یہ ہے کہ یہ مال دراصل ایک تردّد کا شکار ہوتا ہے کہ ضائع کر دیا جائے یا کسی بھلے کام میں صرف کر دیا جائے۔ کیونکہ اس کے صحیح مالک کا تو علم ہوتا نہیں، تو ضرورت اس بات کی ہے کہ بجائے دریا برد کرنے کے اس کو کسی اچھے مصرف میں لگایا جائے۔ اگر اس کو ضائع کر دیا جائے تو ایسا کرنے سے نہ اپنا فائدہ ہوگا اور نہ مالک کے لیے کوئی اجر ہوگا۔ اور اگر کسی

محتاج کو دے دیں تو وہ جب مالک کے لیے دعا کرے گا تو اس کو برکت نصیب ہوگی اور محتاج کی ضرورت بھی پوری ہو جائے گی۔ مالک کو تو اجر بلا کسی تکلیف کے ملے گا' جسے وہ انکار کے بجائے پسند ہی کرے گا۔ حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ کھیتی کاشت کرنے والے اور بونے والے کو اجر ملتا رہے گا' کیونکہ اس کی کھیتی کا فائدہ انسانوں' پرندوں اور دیگر جانوروں کو ہوتا رہتا ہے۔ لیکن کسی کا یہ کہہ دینا کہ صدقہ تو ہمیں پاکیزہ چیز ہی کا کرنا چاہیے' اور یہ اسی صورت میں صحیح ہوگا کہ ہم اس کا ثواب چاہیں (اس کا جواب یہ ہے کہ) دراصل ہم تو اس کے بوجھ سے گلوخلاصی چاہتے ہیں' کیونکہ یہ تردد رہتا ہے کہ تلف کر کے ضائع کر دیا جائے یا صدقہ کیا جائے۔ پھر اس کو ہی بہتر خیال کرنا چاہیے کہ ضائع کرنے کے بجائے صدقہ کرنا ہی بہتر ہے (یہ بھی ان شاء اللہ اجر کا موجب ہوگا) اگر کوئی یہ کہے کہ ''جو ہمیں پسند نہیں وہ دوسروں کے لیے کیوں پسند کریں'' تو اس کا بھی یہی جواب ہے' کیونکہ وہ ہمارے لیے تو حرام ہے اور ہم اس سے مستغنی ہیں' جبکہ محتاج کے لیے دلیل شرعی کی بنا پر حلال ہے۔ مصلحت کا تقاضا بھی جب یہی ہے تو اس کے لیے حلال سمجھنا واجب ٹھہرا۔ چنانچہ ہمیں اس پر مطمئن ہونا چاہیے۔ ہماری رائے یہی ہے کہ جب وہ محتاج اور فقیر ہے تو وہ یہ مال خود اپنے اور اپنے اہل وعیال پر صرف کر سکتا ہے۔ کیونکہ اس کے اہل وعیال اس کی محتاجی کی وجہ سے اس سے غیر متعلق یا دُور نہیں ہو سکتے' بلکہ ان پر تو اس کا صدقہ زیادہ ضروری ہے۔ لیکن اسے چاہیے کہ وہ اپنی ضرورت وحاجت کی حد تک ہی خود پر صرف کرے اور کسی دوسرے محتاج کو بھی دے دے تو اچھا ہے۔

اس موقع پر سائل کے ذہن میں یہ سوال بھی آ سکتا ہے کہ بینک کے ان سودی منافع جات کو لے کر فلاحی کاموں میں خرچ کرنے سے کیا اس کو بھی کچھ ثواب ملے گا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کو صدقہ کرنے کا اصل ثواب تو نہیں ملے گا' البتہ دو اسباب ایسے ہیں جن کی وجہ سے وہ بھی مستحق ثواب قرار پائے گا۔

پہلا سبب: اس حرام مال کے استعمال اور فائدہ اٹھانے سے وہ خود کو ہر طرح بچاتا رہا ہے۔ یہ اس کے لیے باعثِ ثواب ہے۔

دوسرا سبب: وہ ذریعہ بنتا ہے اس زائد مال کو محتاجوں تک پہنچانے کا' اور ایسے اسلامی اداروں کو پہنچانے کا بھی جو اس سے فیض یاب ہونے کا حق رکھتے ہیں۔ چنانچہ اس محنت کا ثواب بھی ضرور اس کو نصیب ہوگا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ واللہ الموفق وھو المستعان۔

(فتاویٰ معاصرہ' از ڈاکٹر یوسف القرضاوی)

نامے چند

حکمت قرآن میں شائع شدہ مضامین کے بارے میں
پروفیسر خورشید عالم اور ڈاکٹر عبدالحی ابڑو کے خطوط
اور متعلقہ حضرات کی وضاحت

حکمت قرآن اکتوبر ۲۰۰۴ء کے شمارے میں لطف الرحمٰن خان صاحب کی جانب سے ''ترجمہ قرآن مجید مع صرفی ونحوی تشریح'' کے سلسلۂ اسباق کی اشاعت کا آغاز کیا گیا تھا۔ اس پر ہمیں جہاں قارئین کی جانب سے تہنیت کے متعدد خطوط موصول ہوئے وہاں قرآن کالج کے فاضل استاد پروفیسر خورشید عالم صاحب کا خط بھی موصول ہوا جنہوں نے اس کی چند اغلاط کی نشان دہی فرمائی تھی۔ چنانچہ اس کے بعد سے یہ سلسلۂ اسباق ہمارے ادارۂ تحریر کے معزز رکن حافظ نذیر احمد ہاشمی صاحب کی نظر ثانی کے بعد شائع ہوتا ہے۔ پروفیسر خورشید عالم صاحب کا خط لطف الرحمٰن خان صاحب کی وضاحت کے ساتھ ذیل میں شائع کیا جا رہا ہے۔

دسمبر ۲۰۰۴ء کے شمارے میں پروفیسر خورشید عالم صاحب کا ایک تحقیقی مضمون ''شوال کے چھ روزے اور امام مالک کا مسلک'' شائع ہوا۔ اس پر ہمیں ماہنامہ السندھ کے ایڈیٹر ڈاکٹر عبدالحی ابڑو صاحب کا خط موصول ہوا جس میں اس مضمون کے چند تسامحات کی نشاندہی کی گئی تھی۔ یہ خط فاضل مضمون نگار کو ارسال کیا گیا تو انہوں نے اس کی وضاحت ارسال فرمائی۔ ڈاکٹر عبدالحی ابڑو صاحب کا خط اور پروفیسر خورشید عالم صاحب کا وضاحتی مکتوب بھی شامل اشاعت کیا جا رہا ہے۔

پروفیسر خورشید عالم صاحب کے مذکورہ بالا مضمون کے بارے میں ہمیں تنظیم اسلامی کے مرکزی ناظم دعوت چوہدری رحمت اللہ بٹر صاحب کا ایک مراسلہ بھی ملا ہے، جس میں موصوف نے اس مضمون پر اظہار خیال فرمایا ہے۔ محترم بٹر صاحب کا یہ مراسلہ بھی آئندہ صفحات میں شائع کیا جا رہا ہے۔

''ترجمہ قرآن مجید' مع صرفی ونحوی تشریح''

پروفیسر خورشید عالم صاحب کے چند اشکالات

محترم عاکف سعید صاحب' مدیر منتظم حکمت قرآن

سلام مسنون!

حکمت قرآن کے اکتوبر کے شمارے میں ''ترجمہ قرآن مجید از لطف الرحمٰن خان'' نظر سے گزرا۔ ادارے نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ حافظ احمد یار مرحوم ومغفور کی کاوشوں کا تسلسل ہے۔ حافظ احمد یار میرے دوست تھے' عربی زبان کے مزاج شناس اور عربی ادب کا ذوق رکھنے والے تھے۔ جو کام انہوں نے شروع کیا تھا اس کے وہ پوری طرح اہل تھے۔ اس کام کو آگے بڑھانے کے لیے ایسا ہی ایک صاحب ذوق ہونا چاہیے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانے میں ہر اُس آدمی کو قرآن کی تفسیر کرنے سے روک دیا تھا جو عربی زبان کا مزاج دان نہ ہو۔

زیر نظر مضمون میں صاحب مضمون نے جس جس مادہ مثلاً ھتواً' وجاھةً' منعاً' سعیاً' خرباً' شرقاً' غرباً' ثماً' سعةً کا ذکر کیا ہے اسے تنوین کے ساتھ منصوب لکھا ہے۔ یہ عربی قاعدے کے خلاف ہے۔ کسی بھی لغت کو اٹھا کر دیکھ لیں وہاں مصدر یا اسم یا تو معرف بالالف واللام ہوگا اور آخر میں رفع ہوگی' اور اگر پہلے ''ال'' نہ ہوگا تو تنوین کے ساتھ رفع ہوگی' بغیر کسی عامل کے اسم کو منصوب لکھنا قطعی غلط ہے۔ یہ تو ایک عام اور موٹے سے قاعدے کی بات ہوئی جو عربی زبان کی شُد بُد رکھنے والا ہر طالب علم جانتا ہے۔

صاحب مضمون نے ﴿هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ﴾ کے ضمن میں ''ھاتوا'' کا مادہ ''ھتو'' بتایا ہے' جو درست نہیں۔ ان کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اس کا مادہ ''ھتی'' یعنی معتل بالیاء ہے نہ کہ معتل بالواو۔ ابن فارس نے مقاییس اللغة اور فیروز آبادی نے القاموس المحیط میں یہی مادہ دیا ہے لہٰذا ''ھتو'' کو اصل بنا کر جو انہوں نے ''ھتاء'' کے معنی لکھے ہیں وہ بھی غلط ہیں اور تاویل باطل کے زمرہ میں آتے ہیں۔

اب آیئے لفظ ''ھَاتِ۔ ھَاتُوا'' کی طرف' اس کے معنی لغت میں پکڑنا' دینا اور لینا ہیں (المعجم الوسیط)۔ یہ فعل اصل میں کیا ہے' اس سلسلہ میں اہل لغت کے درمیان خاصا اختلاف ہے۔ ایک خیال یہ ہے کہ ھاء ہمزہ کے بدلہ میں استعمال ہوئی ہے' اصل میں یہ ''آتـی'' ہے' اسے متعدی بنانے کے لیے ''ھا'' میں بدلا گیا ہے' مگر یہ رائے درست معلوم نہیں ہوتی' کیونکہ متعدی نہ ہونے کی صورت میں تو ہمزہ واپس آنا چاہیے جو نہیں آتا۔ پھر ''ھَاتِ'' اور ''اِئْتِ'' کے معنوں میں فرق

ہے۔ ''هَاتِ'' کے معنی ہیں ''اُحْضِر'' (حاضر کرو) جبکہ ''اِئْتِ'' کے معنی ہیں ''اِحضر'' (آؤ' حاضر ہو جاؤ)۔ دوسری رائے یہ ہے کہ ''ھا'' حرف ہے اور ''تُو'' اتوا کا مخفف ہے۔ زمخشری کی رائے یہ ہے کہ ھاتِ حرفِ صوت ہے جو ''ھا'' کا قائم مقام ہے۔ اس اعتبار سے یہ اسم فعل بنتا ہے۔ حالانکہ وہ فعل ہے' کیونکہ اس سے ضمائر متصل ہوتی ہیں۔ اس مادہ سے نہ ماضی استعمال ہوتی ہے اور نہ مضارع' صرف باب مفاعلہ سے فعل امر آتا ہے اور اس کی گردان ''عَاطِی'' کی گردان کی مانند ہے۔ ھاتِ۔ ھاتیا۔ ھاتوا اور ھاتین۔ سب مفسرین نے اس کے معنی اُحضر (لاؤ) لکھے ہیں۔ اس کا روند نے کے معنوں سے کوئی واسطہ ہی نہیں' کیونکہ اس کا مادہ ہی دوسرا ہے۔ ابوحیان اندلسی نے اپنی تفسیر ''البحر المحیط'' میں زیر نظر آیت کے تحت سیر حاصل بحث کی ہے۔

جہاں تک ''بُرھان'' کے مادہ کا تعلق ہے اس کے بارے میں دو اقوال ہیں۔ ایک قول ہے کہ اس کا مادہ ''بـــرۃ'' ہے جس کے معنی کاٹنے اور قطع کرنے کے ہیں۔ اس صورت میں ''ن'' زائدہ ہے۔ اس مادہ کے باب افعال سے یہ معنی آتے ہیں' یعنی اَبْـــرَہٗ (اُس نے دلیل دی) ابن الاعرابی کا یہی قول ہے' مگر جوہری ''صحاح'' میں کہتے ہیں کہ ''ن'' اصل ہے اور اس کا مادہ ''البـــرھـــنۃ'' ہے جس کے معنی بیان کرنے کے ہیں۔ زمخشری نے ابن الاعرابی کا قول نقل کیا ہے کہ البرھان حجت کو کہتے ہیں اور یہ لفظ ''البرھرۃ'' سے ماخوذ ہے' جس کے معنی سفید لومڑی کے ہیں' جس طرح ''سلطان'' ''سلیط'' سے ماخوذ ہے۔ چمک اور روشنی کی وجہ سے حجت کو برھان کہا جاتا ہے' جسم کی تندرستی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ ''البحر المحیط'' اور ''مصباح اللغات'' میں اس لفظ پر بحث کی گئی ہے۔

صاحب مضمون کو میرا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ وہ آیات کی تشریح کے سلسلہ میں لغوی بحث سے قطعی اجتناب کریں۔ قرآن مجید میں ایک ہی لفظ مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس کا حوالہ دیں اور اس کے لیے امام راغب کی المفردات سے مدد لیں جس کا اردو ترجمہ ہو چکا ہے۔ قواعد اور تراکیب کے سلسلہ میں کشاف' بیضاوی اور البحر المحیط جیسی تفاسیر کو پیش نظر رکھیں۔ اردو تفاسیر میں مولانا تھانویؒ اور مولوی محمد علی لاہوری کی تفسیر کسی حد تک ان کی مدد کر سکتی ہے۔ صاحب مضمون کو اس کام میں ہاتھ نہیں ڈالنا چاہیے جو ان کے بس کا نہیں۔ میں یہ مشورہ انتہائی اخلاص سے دے رہا ہوں' کیونکہ امکان ہے کہ لغوی تشریح کرتے وقت وہ تحریف کے مرتکب نہ ہو جائیں۔

فقط والسلام

پروفیسر خورشید عالم

قرآن کالج

لطف الرحمٰن خان صاحب کی وضاحت

جناب عاکف سعید صاحب' السلام علیکم!

میں پروفیسر خورشید عالم صاحب کا ممنون ہوں کہ انہوں نے میرے کام کو اپنی توجہ کے لائق سمجھا۔ میرے لیے یہ ایک اعزاز ہے اور حوصلہ افزائی کا باعث ہے۔

میری گزارش یہ ہے کہ یہ اسباق میں نے اہل علم کے لیے تو مرتب ہی نہیں کیے ہیں۔ یہ تو ایسے مبتدی طلبہ کے لیے ہیں جنہوں نے عربی گرامر کا ابتدائی علم حاصل کر لیا ہے اور اب اس کی مدد سے وہ قرآن کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ اس لیے ان کو میں اختلاف رائے کی بھول بھلیوں میں نہیں الجھاتا بلکہ کوئی ایک رائے بتا دیتا ہوں۔

محترم حافظ احمد یار صاحب مرحوم تاکید کرتے تھے کہ ماضی' مضارع کے ساتھ مصدر ہمیشہ حالتِ نصب میں لکھو یا بولو۔ میں نے ''المنجد'' کو دوبارہ چیک کیا ہے' اس میں بھی مصادر حالتِ نصب میں لکھے ہوئے ہیں۔ ''المنجد'' میں ہے: ''هَتَاهُ۔ يَهْتُوْهُ۔ هَتْوًا = پاؤں سے روند کر توڑنا۔ هَاتَاهُ۔ مُهَاتَاةً = دینا''۔ روندنے اور دینے کے معانی میں ربط واضح کرنے کے لیے میں نے سبق میں اس طرح لکھا ہے: (مفاعلہ) هِتَاءً = دوسرے کی بات کو روندنا' اپنی رائے دینا۔ ''المنجد'' میں ہے: ''بَرِءَ (س) بَرْءًا = بیماری کے بعد جسم کا بحالت تندرستی آنا۔ اَبْرَءَ = دلیل دینا۔ فقط والسلام

لطف الرحمٰن خان

✿✿✿

''شوال کے چھ روزے.....'' چند تسامحات کی نشان دہی

ماہنامہ ''السندھ'' کے مدیر عبدالحی ابڑو صاحب کا مکتوب

محترمی ومکرمی جناب مدیر حکمت قرآن لاہور' حفظہ اللہ ووفقہ لکل خیر

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

دعا ہے آپ ہر طرح بخیر و عافیت ہوں۔ ''حکمت قرآن'' کا تازہ شمارہ حسب معمول مفید مضامین پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے دروس کا سلسلہ بہت خوب ہے۔ کیا سورۃ الحدید کے دروس کتابی شکل میں بھی دستیاب ہیں؟ اگر ہوں تو ازراہِ کرم ہمیں ایک کاپی قیمتاً ارسال فرمائیں۔

خورشید عالم صاحب کا مضمون ''شوال کے چھ روزے.....'' شریعت کی اصل روح کو اجاگر کرتا ہے۔ ہمارے ماحول میں اس طرح کے مضامین کی وسیع پیمانے پر اشاعت تصورات وخیالات

کی اصلاح کے لیے بہت ضروری ہے (دسمبر کے ''اشراق'' میں بھی اسی قسم کا ایک مضمون ''اجتماعی دعاؤں'' کے حوالے سے اچھا آیا ہے)

خورشید عالم صاحب کا مضمون مجموعی طور پر باعثِ افادیت اور معیار کے لحاظ سے عمدہ ہونے کے باوجود اس میں بعض فنی تسامحات در آئے ہیں جن کی طرف اشارہ کرنا ضروری محسوس ہوتا ہے۔

۱) ''جسے بخاری اور نسائی کے علاوہ......'' کی ترکیب درست معلوم نہیں ہوتی' اسے ''...... کے سوا'' ہونا چاہیے۔ مقالہ نگار کی اختیار کردہ ترکیب کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ بخاری اور نسائی نے بھی اسے روایت کیا ہے جو حقیقت کے برعکس ہے۔ ''سوا'' اور ''علاوہ'' کے معنی میں فرق ہے جسے ملحوظ رکھا جانا چاہیے۔

۲) ص ۴۰ پر دی گئی حدیث کے الفاظ درست طور پر درج نہ ہو سکے' جو یوں ہونے چاہئیں:
''مَنْ صَامَ رَمَضَانَ ' شَهْرٌ بِعَشَرَةِ اَشْهُرٍ ' وَصَامَ سِتَّةَ اَيَّامٍ بَعْدَ الْفِطْرِ ' وَذٰلِكَ تَمَامُ سَنَةٍ''
(غلطیوں کو نشان زد کر دیا ہے)۔

۳) اس حدیث کو ''امام احمد نے مسند میں روایت'' نہیں کیا (جیسے موصوف نے لکھا ہے)' بلکہ یہ دارمی اور ابن ماجہ میں ہے' یہ الفاظ دارمی کے ہو سکتے ہیں' ابن ماجہ کے الفاظ اس سے مختلف ہیں۔

۴) اسے ثوبانؓ (صحابی) نے سعیدؒ (تابعی) سے نہیں (جیسا کہ موصوف فرماتے ہیں) بلکہ سعیدؒ نے ثوبانؓ سے روایت کیا ہے۔

۵) ''صیام الدّھر'' کا ترجمہ ''ہمیشہ کے روزے'' کیا گیا ہے' یہ درست نہیں۔ یہاں ''دہر'' سے مراد ''سال'' ہے' یعنی گویا اس نے پورے سال کے روزے رکھے۔

۶) الروض المُربِع کو المُربع اور المستقنع کو المستنقع لکھا گیا ہے۔ (لا حول ولا قوۃ الا باللّٰہ)

۷) امام ابن تیمیہؒ کے فتاویٰ کا جو حوالہ (جلد ۲۲' ص ۳۰۰) دیا گیا ہے' اس میں یہ آیت کہیں نہیں ملی' آیت تو آگے صفحہ ۳۱۱ پر ہے' مگر وہاں ابن تیمیہؒ کے یہ الفاظ مجھے نہیں ملے۔ شاید کسی اور جگہ ہوں یا غالباً مقالہ نگار نے ابن تیمیہؒ کی پوری بات کا خلاصہ بنا کر دے دیا ہے' اس صورت میں صرف ایک صفحے کا حوالہ ناکافی ہے۔

والسلام
مخلص عبدالحی

پروفیسر خورشید عالم صاحب کا وضاحتی مکتوب

محترم مدیر حکمت قرآن' سلام مسنون!

حکمت قرآن کے دسمبر کے شمارہ میں میرے مضمون ''شوال کے چھ روزے اور امام مالک کا مسلک'' سے متعلق ڈاکٹر عبدالحی ابڑو نے بعض تسامحات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس بارے میں میری گزارشات یوں ہیں:

۱) ''بخاری اور نسائی کے علاوہ'' کی جگہ ''بخاری اور نسائی کے سوا'' ہونا چاہیے تھا۔
۲) حدیث کو ثوبانؓ نے سعیدؒ سے نہیں بلکہ سعیدؒ نے ثوبانؓ سے روایت کیا ہے۔ دراصل میں نے زیر بحث مضمون پر نظر ثانی نہیں کی جس کی وجہ سے یہ تسامح ہوا ہے۔ بعض تسامحات کتابت کی غلطی کی وجہ سے سرزد ہوئی ہیں۔ مثلاً ''تمام السنة'' کی جگہ ''صیام السنة'' ہونا چاہیے تھا۔ اسی طرح کتاب الروض المربع' شرح زاد المستقنع کے لکھنے میں کتابت کی غلطی ہوئی ہے۔ اسے زیادہ سے زیادہ قلم کی لغزش کہا جا سکتا ہے۔ رہی فاضل تبصرہ نگار کی یہ بات کہ اس حدیث کو امام احمد نے روایت نہیں کیا' بالکل غلط ہے۔ کتاب الروض المربع' شرح زاد المستقنع' جلد سوم' صفحہ ۴۴۸ کے حاشیہ پر ہے کہ اس حدیث کو امام احمد' ابوداؤد اور ترمذی نے تین طریقوں سے روایت کیا ہے ۔ مجھے امید ہے فاضل تبصرہ نگار ریکارڈ درست کر لیں گے۔

فاضل تبصرہ نگار نے ''الدھر'' کے معانی جو ''سال'' بتائے ہیں وہ بالکل انوکھے ہیں۔ میں اسے قدرے تفصیل سے بیان کرنا چاہتا ہوں۔

الدھر : احمد بن فارس مقاییس اللغۃ' جلد اول میں فرماتے ہیں کہ اس لفظ کے بنیادی معنی غلبہ اور زبردستی کے ہیں' اور دہر کو دہر اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ہر چیز کو ہلاک کر کے اس پر غالب آ جاتا ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے نبی کریم ﷺ کی حدیث کا حوالہ دیا ہے کہ ((لَا تَسُبُّوا الدَّهْرَ' اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الدَّهْرُ)) ''زمانے کو برا مت کہو کیونکہ اللہ ہی زمانہ ہے''۔ حدیث صاف طور پر بتا رہی ہے کہ الدھر ''ابدیت'' (eternity) کے معنوں میں ہے۔

امام راغب کا قول ہے کہ: ''دہر اصل میں مدتِ عالم کو کہتے ہیں' یعنی ابتدائے آفرینش سے لے کر اس کے اختتام تک''۔

(Time from the beginning of the world to its end)

مجازاً اس سے ہر طویل مدت مراد لی جاتی ہے۔ اس کے برعکس لفظ ''زمان'' تھوڑی اور زیادہ دونوں مدتوں کے لیے بولا جاتا ہے..... یہ لفظ قرآن حکیم میں دو مرتبہ استعمال ہوا ہے اور دونوں مرتبہ ابدیت اور لمبی مدت کے لیے استعمال ہوا ہے۔ ارشاد ربانی ہے: ﴿هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ﴾ (الدھر:۱) ''کیا انسان پر ایک لمبا عرصہ نہیں گزرا''؟ دوسری جگہ ارشاد ربانی ہے: ﴿وَمَا يُهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ﴾ ''ہمیں صرف (مرورِ) زمانہ ہلاک کرتا ہے''۔ ابوعبید کا قول ہے کہ جب عربوں پر کوئی مصیبت نازل ہوتی تو وہ کہتے: اباد نا الدھر (زمانے نے ہمیں نیست و نابود کر دیا) اتی علینا الدھر (زمانے نے ہمیں ہلاک کر دیا) ان مقامات سے ظاہر ہوتا ہے کہ دھر کے معنی دُنیوی زندگی کا سارا عرصہ اور ابدالاباد ہیں۔ عربوں کا عقیدہ تھا کہ زمانہ ان کے دکھ سکھ کا ذمہ دار ہے۔ قرآن نے اس باطل عقیدے کی نفی کی ہے۔ ''المنجد'' میں دھر کو عصر کا مترادف کہا گیا ہے اور ''المعجم الوسیط'' میں اس کے معنی ''ایک ہزار سال یا ایک لاکھ سال'' لکھے ہوئے ہیں۔ اس لیے دہر کے معنی ''سال'' ناممکن ہیں' اس لیے صوم الدھر سے ''ہمیشہ کا روزہ'' ہی مراد ہے۔

میں نے فتاویٰ ابن تیمیہ (جلد ۲۲' ص ۳۰۰) کا حوالہ اس لیے دیا ہے کیونکہ اس صفحہ پر ابن تیمیہ نے ایک نئی فصل باندھی ہے جو صفحہ ۳۱۵ تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس فصل میں امام ابن تیمیہ نے رات کے قیام اور دن کے روزوں' قراءتِ قرآن اور حلال وحرام کے بارے میں نبی کریم ﷺ کی سیرت طیبہ پر تفصیل سے بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ ان باتوں میں میانہ روی اختیار کرنی چاہیے اور غلو سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے آیت مذکورہ (المائدۃ: ۸۷) کا حوالہ دے کر اس کی تشریح فرمائی ہے۔ یہ قطعی طور پر غلط حوالہ نہیں' بلکہ تبصرہ نگار نے خواہ مخواہ بال کی کھال اتارنے کی کوشش کی ہے۔

میں فاضل تبصرہ نگار کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مضمون کی افادیت کو تسلیم کرتے ہوئے بعض غلطیوں کی اصلاح کی کوشش کی ہے۔ ساتھ ہی میں انہیں مشورہ دیتا ہوں کہ کسی مضمون کو پڑھتے وقت یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ میں نے ہر صورت میں اس کی غلطیاں نکالنی ہیں۔

والسلام

پروفیسر خورشید عالم

بقیہ: اقبال کا پیغام

حقیقت حال یہ ہے کہ اقبال کا نصف کلام مسلمانوں کی عدم توجہ یا عدم اعتناء کی وجہ سے obsolete یعنی منسوخ اور متروک ہو چکا ہے۔ مثلاً:

نغمۂ خاموش دارد سازِ وقت غوطہ در دل زن کہ بینی رازِ وقت

(اسرار ورموز: وقت)

(سازِ وقت نغمۂ خاموش رکھتا ہے اور اگر تو زمان کے راز سے آگاہ ہونا چاہتا ہے تو اپنے دل میں غوطہ لگا۔)

مدّاحین وعاشقانِ اقبال میں سے کتنوں نے (اپنے دل میں) غوطہ لگایا ہے؟

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن!

کتنے عاشقانِ اقبال آج تک اپنے من میں ڈوبے ہیں؟ اس قسم کے اشعار سینکڑوں سے متجاوز ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ اقبال کا کلام ایک پیغام ہے اور پیغام پر عمل کرنا لازمی ہے۔ صرف اس کی داد یا تحسین ایک فعل عبث ہے۔ مثلاً طبیب کا نسخہ' اگر مریض اسے استعمال کرنے کے بجائے صرف زبان سے اس کی تحسین کرتا رہے گا تو اس کے مرض کا کبھی ازالہ نہیں ہو سکے گا۔

* * *

شوال کے چھ روزے

تحریر: رحمت اللہ بٹر*

ماہنامہ ''حکمت قرآن'' کے شمارہ بابت دسمبر ۲۰۰۴ء میں ''شوال کے چھ روزے اور امام مالک کا مسلک'' کے عنوان سے محترم جناب خورشید عالم کی ایک تحریر شائع ہوئی۔ اس کے حوالے سے جو عمومی تأثرات پیدا ہوتے ہیں ان کے پیش نظر کچھ گزارشات پیش خدمت ہیں۔

دراصل نبی اکرم ﷺ کے دَور میں اقامت دین کی جدوجہد اتنی گھمبیر اور تیز تھی کہ عبادات کے معاملے بس وہ کم از کم چیزیں اختیار کی گئیں جو انسان کے تعلق مع اللہ کے لیے ضروری تھیں۔ لیکن چونکہ زمانہ ایک جیسا نہیں رہتا اس لیے رسول اللہ ﷺ نے اس بات کے پیش نظر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں فرض عبادات کے علاوہ کچھ سنتوں، مستحبات اور نوافل وغیرہ کی بھی ترغیب وتشویق پیدا کی تاکہ ہر آدمی اپنے شوق اور استطاعت کی حد تک اِن سنن و مستحبات سے استفادہ کرتے ہوئے اللہ کا تقرب حاصل کر سکے۔ لیکن بعض اوقات انسان فہم دین میں کمی اور غلو کی بنا پر بدعات کی راہ پر چل نکلتا ہے۔ اب اِن بدعات کے خوف سے اُن سنن ونوافل کو بدعات قرار دے کر سنتوں کے کھاتے ہی سے نکال دینا جن کی حضور ﷺ نے ترغیب وتشویق دلائی ہے، کسی طور بھی روا نہیں، بلکہ دین میں اپنے نظریات کو داخل کرنے کے مترادف ہے اور یہ بہت بڑی جسارت ہے۔ مثلاً عصر اور عشاء کی غیر مؤکدہ سنتیں، ایامِ بیض، شوال اور یومِ عرفہ کے روزے بدعات نہیں ہیں، بلکہ نبی اکرم ﷺ کی اختیار کردہ سنتیں ہیں۔

اصل ضرورت اس بات کی ہے کہ لوگوں میں دین کا علم طلب کرنے کی جستجو پیدا کی جائے اور سنن ومستحبات وغیرہ کو دین سے نکالنے اور انہیں بدعات قرار دینے سے بچا جائے۔

اب دیکھئے فاضل مضمون نگار نے عاشورہ کے روزوں کو تو قبول کر لیا ہے لیکن باقی روزوں کو مشکوک بنا دیا ہے، حالانکہ امام مسلمؒ نے اِن روزوں کے لیے علیحدہ علیحدہ باب

☆ مرکزی ناظم دعوت تنظیم اسلامی پاکستان

باندھے ہیں۔

شوال کے چھ روزوں کے بارے میں امام مسلمؒ نے باب باندھا ہے: باب استحباب صوم ستة ایام من شوال اتباعا لرمضان۔ اس کے ذیل میں حضرت ابوایوب انصاری ؓ سے روایت کردہ حدیث لائے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ صَامَ رَمَضَانَ ثُمَّ اَتْبَعَهُ سِتًّا مِنْ شَوَّالٍ كَانَ كَصِيَامِ الدَّهْرِ)) (۱)

''جس نے رمضان المبارک کے روزے رکھے' پھر اس کے ساتھ ہی شوال کے چھ روزے ملا دیئے تو یہ عمل ہمیشہ کے روزوں کے مانند ہے۔''

اس حدیث کی رو سے یہاں شوال ہی کے روزے مراد لیے جائیں گے۔ ان کے علاوہ ہر ماہ میں تین روزوں اور ترجیحاً ایامِ بیض کے روزوں کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کے اتنے فرمودات ہیں کہ ان سے اعراض سنتِ رسول ﷺ سے اعراض کے مترادف ہے۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کا معاملہ تقریباً تمام کتب احادیث میں آیا ہے کہ وہ اکثر روزہ رکھتے تھے' لیکن اُن کو نبی اکرم ﷺ نے ہر ماہ تین روزے رکھنے کا مشورہ دیا کہ اگر کوئی یہ کرلے گا تو گویا اُس کا یہ عمل اس کے لیے سال بھر کے روزوں کے برابر ہوگا۔

ہر ماہ تین دن کے روزوں کے بارے میں امام مسلم نے باب باندھا ہے: ''باب استحباب صیام ثلاثة ایام من کل شهر وصوم یوم عرفة وعاشوراء والاثنین والخمیس'' اور اس باب کے تحت تین احادیث لائے ہیں جن میں تین دن کے روزوں یعنی یومِ عرفہ' پیر اور جمعرات کے روزوں کی ترغیب ہے۔ اس بارے میں مسند امام احمد میں حضرات ابوہریرہ اور ابوسعید خدری ؓ سے تقریباً ۱۲ روایات تو مَیں نے خود پڑھی ہیں۔ (حوالے کے لیے ملاحظہ ہو: مسند امام احمد' طبعۂ جدیدہ' ح ۷۴۰۹' ۷۵۲۲' ۷۵۴۱' ۷۵۴۲' ۷۶۱۸' ۶۲۵۶' ۵۶۱۱' ۸۰۴۴' ۸۱۵۷' ۸۲۲۹' ۱۰۸۲۷' ۱۱۰۱۴ اور ۱۱۱۶۶)

ایامِ بیض کے روزوں کے بارے میں امام ابوداؤد اور امام نسائی یہ روایت لائے ہیں کہ آپؐ ایامِ بیض کے روزوں کا حکم فرماتے تھے اور آپؐ نے اُن کو سال بھر کے روزوں کے برابر قرار دیا۔ مزید یہ کہ امام نسائی تو حضرت ابن عباس ؓ سے مروی یہ حدیث بھی لائے ہیں:

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا يُفْطِرُ اَيَّامَ الْبِيْضِ فِيْ حَضَرٍ وَّلَا سَفَرٍ (۲)

(۱) اس حدیث کو امام مسلم کے علاوہ امام ابوداؤد' امام ترمذی اور امام احمد نے بھی روایت کیا ہے۔

(۲) سنن النسائی' کتاب الصیام' باب صوم النبی بابی ھو وأمی وذکر اختلاف الناقلین

''رسول اللہ ﷺ ایامِ بیض کے روزے نہیں چھوڑتے تھے۔ حضر میں بھی اور سفر میں بھی''۔

اسی طرح امام بخاریؒ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ وہ فرماتے ہیں:

اَوْصَانِیْ خَلِیْلِیْ بِثَلَاثٍ ، لَا اَدَعُھُنَّ حَتّٰی اَمُوْتَ : صَوْمِ ثَلَاثَةِ اَیَّامٍ مِنْ کُلِّ شَھْرٍ وَصَلَاةِ الضُّحٰی وَنَوْمٍ عَلٰی وِتْرٍ (۱)

''مجھے میرے خلیل ﷺ نے مجھے تین باتوں کی وصیت کی ہے' جنہیں میں موت تک ترک نہیں کروں گا: ہر مہینے (ایام بیض کے) تین روزے' نمازِ چاشت ادا کرنا اور وتر پڑھ کر سونا''۔

اسی طرح یومِ عرفہ کے روزے کو حضور ﷺ نے عرفہ میں موجود حاجیوں کے لیے منع فرمایا' جس سے یہ بات خود بخود ثابت ہوتی ہے کہ حاجیوں کے علاوہ باقی لوگوں کے لیے یہ مسنون ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' وہ فرماتے ہیں:

اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ نَھٰی عَنْ صَوْمِ یَوْمِ عَرَفَةَ بِعَرَفَةَ (۲)

''حضور ﷺ نے قیامِ عرفہ کے دوران (یعنی حاجیوں کو) یومِ عرفہ کے روزہ سے منع فرمایا ہے۔''

ان احادیث کی روشنی میں ان مسنون روزوں کو مسنون اور مستحب روزوں کو مستحب قرار نہ دینا کسی طور بھی درست نہیں ہے۔ یہ امر قابل توجہ ہے کہ لوگوں کو اِن کی حیثیت کے بارے میں آگاہ کیا جائے' تاکہ جو کوئی بھی ان پر عمل کرے وہ رسول اللہ ﷺ کے فرمودات کے مطابق ہی عمل کرے۔

فاضل مضمون نگار نے شوال کے چھ روزوں کے بارے میں امام مالکؒ کا یہ موقف بیان کیا ہے کہ وہ انہیں مکروہ گردانتے تھے۔ پھر اس کے بارے میں ابنِ رشد کے بیان کردہ تین احتمالات ذکر کیے ہیں۔ ان میں سے دوسرا احتمال یہ ہے کہ ''ہوسکتا ہے کہ ان تک یہ روایت نہ پہنچی ہو''۔ اور یہی احتمال قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے' اس لیے کہ احادیث کے اکثر مجموعے ان کے بعد مرتب ہوئے ہیں۔ oo

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب الجمعة' باب صلاة الضحی فی الحضر

(۲) سنن ابی داؤد' کتاب الصوم' باب فی صوم یوم عرفة بعرفة

ہفت روزہ فدائے خلافت لاہور کا

تحریک پاکستان نمبر

زیرادارت: سید قاسم محمود

پوری آب وتاب کے ساتھ شائع ہوگیا ہے

یہ دستاویزی شمارہ پانچ حصوں پر مشتمل ہے:

(1) پہلی جنگ آزادی سے قیام کانگریس تک (1857ء۔1885ء)

(2) علی گڑھ تحریک سے تقسیم بنگال تک (1886ء۔1905ء)

(3) قیام مسلم لیگ سے خطبہ الٰہ آباد تک (1906ء۔1930ء)

(4) خطبہ الٰہ آباد سے دوسری جنگ عظیم تک (1930ء۔1939ء)

(5) قرارداد لاہور سے قیام پاکستان تک (1940ء۔1947ء)

عام قارئین اور طالب علموں کے لئے یکساں مفید

90 صفحات پر مشتمل اس گراں قدر خصوصی شمارے کی قیمت 50 روپے ہے

(بذریعہ ڈاک طلب کرنے والے حضرات اگر قیمت بذریعہ منی آرڈر یا ڈاک ٹکٹوں کی صورت میں پیشگی ارسال کردیں گے تو رجسٹرڈ ڈاک کے اخراجات مکتبہ برداشت کرے گا۔ وی پی پی منگوانے کی صورت میں ڈاک خرچ 20 روپے بذمہ خریدار ہوگا)

نوٹ: سابقہ خصوصی اشاعتوں میں سے سقوطِ ڈھاکہ نمبر، کشمیر نمبر اور نظریہ پاکستان نمبر محدود تعداد میں دستیاب ہیں۔

مکتبہ خدام القرآن لاہور

K-36 ماڈل ٹاؤن لاہور فون: 03-5869501